قفس

(تیرہ افسانوں کا مجموعہ)

مصنفہ:-

اوپندر ناتھ اشک

منتخبہ:-

کرشن چندر

مطبوعہ محبوب المطابع دہلی

قیمت ایک روپیہ بارہ آنے

طبع اوّل

فہرستِ مضامین

حرفِ آغاز

"نقش" میں میرے تیرہ افسانے درج ہیں۔ ان کا انتخاب بھی کرشن چندر نے کیا ہے اور انھوں نے اس بات کا خیال رکھا ہے کہ اس میں ہر مذاق کے لوگوں کی پسند کا کوئی نہ کوئی افسانہ ضرور ہو۔ ان کی اس کوشش سے میری افسانہ نویسی کے مختلف ارتقائی مراحل کی نمائندگی بھی ہو گئی ہے۔

میرا پہلا افسانہ ۱۹۲۶ء میں لاہور کے روزانہ "پرتاپ" میں شائع ہوا تھا۔ اس وقت میں آٹھویں جماعت میں پڑھتا تھا۔ جب میں نے ۱۹۳۱ء میں جالندھر کے ڈی۔اے۔وی کالج سے بی۔اے کی ڈگری لی تو "نورتن" کے نام سے میرے افسانوں کا پہلا مجموعہ شائع ہوا تھا۔ اور میرے افسانے لاہور کے متعدد روزانہ اور ہفتہ وار اخباروں میں شائع ہو رہے تھے۔ ۱۹۲۶ سے ۱۹۳۱ء تک میں نے پچاس کے قریب افسانے لکھے لیکن ان میں 'نورتن' کے علاوہ سب ناقابلِ توجہ تھے۔

نورتن کی وجہ سے میری ملاقات سدرشن جی سے ہوئی۔ میں ویر بھارت میں نیا نیا ملازم ہو کر لاہور پہنچا تھا۔ اور دفتر کے عین مقابل سدرشن صاحب کا مکان تھا ان دنوں انھوں نے 'چندن' جاری کیا تھا۔ میلا رام وفا ایڈیٹر ویر بھارت سے ان کی گہری دوستی تھی۔ ایک دن سدرشن صاحب ہمارے دفتر میں آئے تو میں نے پہلا مجموعہ ان کی خدمت میں پیش کیا۔ پہلی ہی کہانی پڑھ کر انھوں نے مجھے 'چندن' میں لکھنے کی دعوت دی۔ اس وقت سے میری کہانیوں کا دوسرا دور شروع ہوتا ہے۔ اس دور کی کہانیاں ۱۹۳۲ء میں "عورت کی فطرت" کے نام سے شائع ہوئیں۔ ان دنوں ترقی

پسندی یا نفسیاتی تجزیہ کا کسی نے نام بھی نہ سُنا تھا۔ اس مجموعہ کی سب کہانیاں سوشل تھیں۔ اور ان میں معاشرتی مسائل کو ایک آدرشی رنگ میں پیش کیا گیا تھا۔ اس وقت کی افسانہ نویسی اسی طرز کی تھی۔ منشی پریم چند مرحوم نے اس کا دیباچہ لکھا۔ اور اگرچہ بقول ان کے ان افسانوں میں تاثیر بدرجہ اتم موجود تھی۔ جدت و ندرت اور دلچسپی کا بھی فقدان نہ تھا لیکن میرے خیال میں ان میں حقیقت کی چاشنی کم تھی۔ ان افسانوں کے کردار زندگی کی جیتی جاگتی تصویریں ہونے کے بجائے تصور کی دُنیا میں بستے تھے۔ اور اگرچہ ان کا وجود امکان کے باہر کی بات نہ تھی لیکن حقیقی دُنیا میں جنم لینے کی بجائے وہ تصور ہی میں پیدا ہو کر پروان چڑھتے تھے۔ یہ درست ہے کہ ان افسانوں کی بنیاد کسی نہ کسی نفسیاتی صداقت ہی پر رکھی گئی تھی لیکن نفسیاتی تجزیہ ان میں مفقود تھا۔ اور یہ افسانے بھی موجودہ معیار پر پورے نہ اُترتے تھے۔

۱۹۳۴ء میں اخبارات کی زندگی سے تنگ آ کر میں قانون پڑھنے لگا لیکن ابھی میں پہلے ہی سال میں تھا کہ میری بیوی بیمار ہو گئی۔ میری تعلیم اور اس کی علالت ساتھ ساتھ چلتی گئیں۔ اِدھر ۱۹۳۶ء میں میں نے قانون کی ڈگری لی۔ اُدھر اس کی وفات ہو گئی۔ اس کے بعد جی ایسا اُچاٹ ہوا کہ پریکٹس یا پی۔ سی۔ ایس کے مقابلہ کا خیال چھوڑ اپنے طبعی رجحان کے مطابق افسانے اور ڈرامے لکھتا گیا۔

میری پہلی بیوی کی علالت اور موت دراصل وہ سانحہ ہے جس نے میری سطحی نگاہ کو زندگی کی گہرائی دی۔ حصول تعلیم کے ساتھ ساتھ حصولِ معاش کے لئے تگ ودَو اور پھر بیوی کی علالت۔ یہی وہ عرصہ ہے جب زندگی نے جوانی کی ساقی لوحی اور رومان پسندی کے امرت میں تلخ حقیقت کا رس بھرنا شروع کیا۔ میں زندگی سے بلاواسطہ طور پر دوچار ہوا۔ اور تصور کی آنکھوں سے دیکھنے کی بجائے میں نے دُنیا کو حقیقت کی آنکھوں سے دیکھنا سیکھا۔ اسی عرصے میں میں نے ’۴۴۳۳ ، اور

'ڈاچی' دو افسانے لکھے۔

'۳۴۴' اور 'ڈاچی' یہ دونوں کہانیاں میرے افسانوں میں ایک اہم درجہ رکھتی ہیں۔ یہاں سے میری رومانی اور اصلاحی کہانیاں زندگی کی حقیقی تلخی اور درد سے روشناس ہوتی ہیں۔ '۳۴۴' کے بعد میں نے جو افسانے لکھے ان میں جماعتی تفاوت کے علاوہ نچلے متوسط طبقے کی برائیوں کو نہایت بے دردی سے بے نقاب کرنے کی کوشش کی گئی تھی۔ "قفس" اس دور کا بہترین افسانہ ہے۔

اس وقت تک میں معاشرتی زندگی کی عکاسی میں اس حد تک الجھا رہا کہ میں سماج کی سب سے بڑی خرابی 'جنسی ناہمواری' کی طرف توجہ نہ دے سکا۔ لیکن اس نئی نگاہ سے جو ۱۹۳۶ء میں مجھے ملی۔ اور ان حالات کی وجہ سے جن سے میں اپنی پہلی بیوی کی وفات کے بعد گذرا میری نظروں سے سماج کے اس تکلیف دہ زخم کا چھپا رہنا ناممکن تھا۔ چنانچہ ۱۹۳۸ء میں میں نے اپنا افسانہ 'کونپل' لکھا جس میں لطیف پیرایہ میں میں نے اس جنسی تفاوت کی طرف اشارہ کیا۔

'کونپل' سے میری بیانیہ کہانی نفسی تجزیہ کی پُرپیچ راہوں میں داخل ہوتی ہے۔ یہیں سے میری کوشش شروع ہوئی کہ میرے اشارے واضح اور ابہام سے پاک ہوں۔ طنز تیکھی اور تلخ، منظر کشی خلوص اور دیانتداری کی حامل ہو۔ اور میرا اسلوب بیان بیباک اور توانا ہوتا جائے۔ چنانچہ یہیں سے میرے افسانوں کا دَور شروع ہوتا ہے جو میرے تازہ ترین افسانہ "اُبال" میں اپنے عروج پر پہنچتا ہے۔

کرشن چندر نے 'عورت کی فطرت' اور اس سے پہلے کے افسانوں کو چھوڑ دیا ہے۔ اور بعد کے رومانی اور معاشرتی افسانوں میں ہر مذاق کے لوگوں کی پسند کے افسانے چُنے ہیں۔ شروع ہی سے میں افسانچے بھی لکھتا آرہا ہوں۔ یہ افسانچے زندگی کے مختلف واقعات کو لیکر لکھے گئے ہیں۔ کرشن چندر نے موجودہ مجموعے میں

میرے دو افسانچے 'بگولے' اور 'آرٹسٹ' بھی شامل کئے ہیں۔ اور مجھے یہ کہنے میں ذرا بھی جھجک نہیں کہ یہ میرے بہترین افسانچے ہیں۔

تیس ہزاری دلی
۵۔ مارچ ۱۹۴۳

اوپندر ناتھ اشک

قفس

شانتی نے جھنجھلا کر کاغذ کے ٹکڑے کر دیئے اور اُٹھ کر بے چینی سے کمرے میں گھومنے لگی۔ اسے یکسوئی حاصل نہ تھی۔ لکھتے لکھتے اس کا خیال کہیں سے کہیں چلا جاتا تھا۔ وہ صرف چار سطریں لکھنا چاہتی تھی لیکن جو کچھ وہ لکھنا چاہتی تھی اس سے لکھا نہ جاتا تھا۔ جذبات کی رَو میں کچھ کا کچھ لکھ جاتی تھی۔

گھومتے گھومتے وہ چُپ چاپ کھڑکی میں جا کھڑی ہوئی۔ شام کا سورج دور مغرب میں ڈوب رہا تھا۔ مالی نے کیاریوں میں پانی چھوڑ دیا تھا۔ اور دن کی تپش سے پژمردہ مُرجھائے ہوئے پھول گویا نئی زندگی پا کر کھِل اٹھے تھے۔ ہلکی ہلکی ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا چلنے لگی تھی۔ شانتی نے دور ۔۔۔ ڈوبتے ہوئے سورج کی طرف نگاہ دوڑائی۔ پیلی پیلی سنہری کرنیں گویا ڈوبنے سے پہلے ان ننھے بچوں کے کھیل میں جی

بھر کر حصہ لے لینا چاہتی تھیں، جو سامنے کے میدان میں ہری ہری گھاس پر، اونچ نیچ سے بے پرواہ آزادی سے کھیل رہے تھے۔ سڑک پر دو نوجوان مزدور لڑکیاں ہنستی کھیلتی چہلیں کرتی چلی جا رہی تھیں۔ شانتی نے لمبی سانس لی اور پھر مڑ کر اپنے ارد گرد ایک تھکی ہوئی نگاہ دوڑائی ——— چھت پر بھاری آواز سے لگاتار چلنے والا برقی پنکھا، دروازوں پر آہستہ آہستہ ہلتے والے ریشمی پردے میتول، قالین ایال بھرے پُرسے سے بھاری کوچ اور ان پر رکھے ہوئے ریشمی گدے، غالیچے اور ان پر رکھی ہوئی چھوٹی چھوٹی تپائیاں اور پیتل کے ننھے ننھے ہاتھی اور پھول دان ——— اور اس نے اپنے آپ کو اُس پنچھی سا محسوس کیا جو اس آسمان کے نیچے، کھلی آزاد ہوا میں آم کی ڈالی سے بندھے ہوئے سونے کے پنجرے میں لٹک رہا ہو۔

اس وقت نوکر اس کے چھوٹے لڑکے کو زبردستی کھینچتا ہوا لایا۔ دھوبی کی لڑکی سے کھیل رہا تھا، ہٹائے نہ ہٹتا تھا۔ آؤ دیکھا نہ تاؤ اور شانتی نے لڑکے کو پیٹ دیا۔ "کیوں تو ان کمینوں کے ساتھ کھیلتا ہے؟ کیوں کھیلتا ہے تو؟ اتنے بڑے باپ کا بیٹا ہو کر ———" اور اس کی آواز چیخ کی حد کو پہونچ گئی۔

حیرت زدہ نوکر نے بڑھ کر بچے کو زبردستی چھڑا لیا۔ شانتی جا کر دھم سے کوچ میں دھنس گئی۔ اور اس کی آنکھوں سے بے تحاشا آنسو بہنے لگے۔

وہیں بیٹھے بیٹھے اس کی آنکھوں کے سامنے ماضی کی کئی تصویریں پھر گئیں۔

اس وقت اس کے شوہر نے لانڈری کا کام شروع ہی کیا تھا۔ بائیبل سوسائٹی کے سامنے (جہاں آج کل ایک دنداں ساز دھڑلے سے لوگوں کے دانت اکھاڑنے میں مصروف ہے) ان کی لانڈری تھی۔ آمدنی اچھی تھی لیکن خرچ بھی کم نہ تھا۔ ۳۵ روپئے تو دکان کا کرایہ ہی دینا پڑتا تھا اور پھر کپڑے دھونے اور پریس کرنے کیلئے جو طویلہ لے رکھا تھا اس کا کرایہ الگ تھا۔ اس کے علاوہ دھوبیوں کی تنخواہ، کوئلے، مسالہ اور بیبیوں

بکھیڑے۔ ان تمام اخراجات کے بعد جو تھوڑا بہت بچتا تھا اس سے بہ مشکل تمام گھر کا خرچ چلتا تھا۔

ان کا گھر دوکان کے عقب ہی میں واقع تھا۔ منی لال اسٹریٹ میں ــ یہ گلی جب بھی ایسی ہی تھی جیسی اب ہے۔ اگرچہ دس برس کے عرصہ میں مکانوں کی صورت کچھ نکل آئی ہے لیکن مکینوں میں کوئی خاص تبدیلی نہیں واقع ہوئی۔ اب بھی اس علاقہ میں ادنیٰ طبقے کے لوگ بستے ہیں اور جب بھی بستے تھے۔ نم دار اندھیری کوٹھڑیوں میں چمار، جمیور، گوجرا ور شدھ ہندو رہتے ہیں۔ ایک ہی کوٹھڑی باورچی خانے، بیٹھک اور سونے کے کمرے کا کام دیتی ہے۔ ساس سسر، بیٹا بہو، لڑکیاں لڑکے، اور بارہا پوتیاں پوتے اسی کوٹھڑی میں سوتے ہیں۔

جس مکان میں شانتی رہتی تھی اس کے نیچے ایک طرف ٹینڈی چمار اپنے آٹھ لڑکو اور لڑکیوں کے ساتھ زندگی کو ٹھیلے جاتا تھا۔ چوڑی گلی کی طرف ماڑواڑی بنیے کی دکان تھی اور تیسری طرف (جدھر دروازہ کھلتا تھا) بھنگیوں نے تنور لگا رکھا تھا جس کا دھواں صبح شام ان کے باورچی خانہ میں آیا کرتا تھا۔ اور شانتی گرمیوں کے موسم میں بھی ہوتی کی کھڑکی کو بند رکھنے پر مجبور رہو جاتی تھی۔

گرمیوں کے دن تھے اور کمیٹی کا نلکا کافی دور، اس لئے شانتی نے اردگرد کی عزیزوں کی سہولیت کے خیال سے انھیں ڈیوڑھی کے نلکے سے پانی لینے کی اجازت دیدی تھی۔ لیکن جب اس مکان میں آئے انھیں کچھ دن بیتے تو شانتی کو معلوم ہو گیا کہ یہ فراخدلی بہت مہنگی پڑے گی۔ ایک دن جب نہانے کے بعد اس کا شوہر صابن دانی نیچے بھول آیا اور شانتی اسے اٹھانے گئی تو وہ ندارد تھی۔ پھر کچھ دن بعد تولیہ غائب ہو گیا اور اسی طرح ہر دوسرے تیسرے کوئی نہ کوئی چیز گم ہونے لگی۔ آخر ایک دن شانتی نے نلکے کی ٹونٹی پر لکڑی کا بکس لگوا کر اس پر چھوٹا سا قفل چڑھا دیا اور اس کی چابی اپنے

پاس رکھ لی۔

دوسرے دن جب وہ ایک ہی دھوتی سے بدن ڈھانپنے پسینے سے تر بتر چولھے کے پاس بیٹھی کھانا پکا رہی تھی تو اس نے اپنے سامنے ایک کالی کلوٹی لڑکی کو کھڑے دیکھا۔ لڑکی اس کی ہم عمر ہی تھی لیکن توے سی کالی اور نہایت ہی میلی کچیلی دھوتی اور بنڈی پہنے ہوئے! سر میں بھی وہ سرسوں ہی کا تیل لگاتی ہوگی۔ کیونکہ اس کی پیشانی پر بالوں کے نیچے پسینے کی وجہ سے تیل میں ملی ہوئی میل کی ایک لکیر سی بن گئی تھی چوڑا سا منہ اور چپٹی سی ناک، الجھن کے مارے شانتی کا گلا بھر آیا اور نفرت سے اس نے منہ پھیر لیا۔ آج تک گھر کی جمعدارن کے علاوہ نیچے رہنے والی نیچ ذات کی کسی لڑکی کو اوپر آنے کی جرأت نہ ہوئی تھی۔ اور نہ خود ہی اس نے کسی سے راہ و رسم بڑھانے کی کوشش کی تھی۔

لڑکی مسکرا رہی تھی اور اس کی آنکھوں میں عجیب سی چمک تھی "کیا بات ہے؟" جیسے آنکھوں ہی آنکھوں میں شانتی نے پوچھا۔

ذرا مسکراتے ہوئے لڑکی نے درخواست کی "بی بی جی پانی لینا ہے"

"ہمارا نلکا بھنگی چماروں کیلئے نہیں"

"ہم نہ بھنگی ہیں نہ چمار!"

"پھر کون ہو؟"

"میں بی بی جی مندر کے پجاری کی لڑکی . . ."

شانتی نے دھوتی سے چابی کھول کر اس کی طرف پھینک دی۔ زیادہ عرصے اس کالی کلوٹی میلی کچیلی لڑکی کی باتیں سننا شانتی کو گوارا نہ تھا۔

لیکن اس سیاہ جسم میں دل سیاہ نہ تھا۔ اور جلد ہی شانتی کو اس بات کا پتہ چل گیا۔ گومتی روز صبح شام چابی لینے آتی۔ گلی میں پوربیوں کا جو مندر تھا وہ اس کے پجاری

کی لڑکی تھی۔ امیر مندروں کے پجاری بھی موٹروں میں گھومتے ہیں۔ یہ مندر تھا غریب پوربیوں کا، جن میں سے اکثر چوکیدار، چپراسی، سائیس یا مزدور تھے۔ پجاری کا کنبہ بھی گلی کے ایک طرف بھنگیوں کی چارپائیوں کے ساتھ سوتا تھا۔ اور جب رات کو کوئی تانگہ ادھر سے گذرتا تو اکثر کسی نہ کسی کی چارپائی اس کے ساتھ گھسٹتی ہوئی چلی جاتی۔ مندر میں ایک کنواں تو تھا لیکن جب سے ادھر نلکے آئے اس پر ڈول کبھی نہ دیکھے گئے۔ جب نزدیک ہی کسی کی ڈیوڑھی یا سیڑھیوں کے نلکے سے آسانی پانی مل جائے تو پھر کنوئیں پر بازو کون تھکائے؟ . . . . اسی لئے گومتی اب ہر روز پانی لینے اور کچھ پانی لینے کے بہانے باتیں کرنے صبح شام آجاتی۔ اپنی گاگر جس میں پانی کے دو ایک پتے ہمیشہ تیرا کرتے نلکے کے نیچے رکھ کر اوپر چلی آتی۔ اور پھر باتوں باتوں میں بھول جاتی کہ وہ پانی لینے آئی ہے۔ اور اس وقت تک نہ اٹھتی جب تک کہ اس کی بڈھی دادی گلی میں اپنی چارپائی پہ بیٹھے بیٹھے اس کا نام لے کر کئی بار نہ چیختی۔

اس کا یہ مطلب نہیں کہ اس دوران میں شانتی اور گومتی آپس میں کچھ نزدیک آگئی تھیں۔ صرف یہ ہوا کہ جب شانتی رسوئی میں کھانا پکاتی یا اندر کمرے میں بیٹھی کپڑے سیتی تو اسے گومتی کا سیڑھیوں میں بیٹھ کر باتیں کرتے رہنا برا نہ لگتا۔ کئی طرح کی باتیں ہوتیں۔ چماروں کے گھریلو جھگڑوں کی باتیں، شرابی پوربیوں کی باتیں اور پھر گومتی کی اپنی باتیں۔

اسی دوران میں شانتی کو معلوم ہو گیا کہ گومتی کی شادی ہوئے کئی برس گذر چکے ہیں لیکن اس نے اپنے شوہر کی صورت تک نہیں دیکھی۔ کوئی کام نہیں کرتا اس لئے نہ وہ اسے لینے آتا ہے اور نہ اس کے پتا اسے اس کے ساتھ بھیجتے ہیں۔

کئی بار چھیڑنے کی غرض سے اور کئی بار محض تفریح کیلئے شانتی اس سے اس کے شوہر کے متعلق استفسار کرتی۔ جواب دیتے وقت گومتی ہمیشہ شرما جاتی۔

لیکن ان سب باتوں کے باوجود اس کی جگہ وہیں سیڑھیوں پر بنی رہی۔

پھر کس طرح پجاری کی وہ کالی کلوٹی لڑکی وہاں سے اٹھ کر اس کے اتنی نزدیک آگئی کہ شانتی نے ایک بار اسے بے ساختہ آغوش میں لیکر کہہ دیا کہ آج سے تم میری بہن ہوئیں گومتی۔ یہ سب باتیں آج بھی شانتی کو اچھی طرح یاد تھیں۔

سردیوں کی رات تھی اور انارکلی میں سب طرف دھواں ہی دھواں ہو رہا تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ لاہور کے تمام رسوئی گھروں، ہوٹلوں، تنوروں، کل کارخانوں سے دن بھر اٹھتا رہنے والا دھواں ایک ہی بار اکٹھا ہو کر انارکلی پر پل پڑا ہے۔ شانتی اپنے ننھے کو کندھے سے لگائے ہاتھ میں کچھ ہلکے پھلکے لفافے تھامے خرید فروخت کر کے چلی آ رہی تھی۔ وہ کئی دن کے اصرار کے بعد اپنے خاوند کو ادھر لانے میں کامیاب ہوئی تھی۔ اور انھوں نے جی بھر کر چیزیں خریدی تھیں۔ انارکلی کے درمیان بنگالی رس گلوں کی جو دکان ہے وہاں سے رس گلے کھانے کو شانتی کا من بڑا مچلا کرتا تھا لیکن اس کے شوہر کو کبھی اتنی فرصت نہ ہوئی تھی کہ وہاں تک صرف رس گلے کھانے کیلئے جا سکے۔ ہسپتال روڈ کے سرے پر حلوائی کے ساتھ چاٹ والے کی جو دکان ہے اس کی چاٹ کا مزا لینے کو شانتی کا بڑا جی چاہتا تھا۔ لیکن چاٹ جیسی نکمی چیز کے لئے دکان چھوڑ کر جانے کی فرصت شانتی کے شوہر کو کہاں تھی۔ کئی دن سے وہ اپنے آدمی کیلئے کچھ گرم کپڑوں کے ٹکڑے خریدنا چاہتی تھی۔ سردی بڑھ رہی تھی اور اس کے پاس ایک بھی کوٹ نہ تھا اور پھر گرم کپڑا نہ سہی اس کا خیال تھا کہ کچھ اون ہی لے لی جائے تاکہ ننھے کا سوئٹر ہی بنا جا سکے۔ لیکن اس نے جب بھی اپنے شوہر سے کہا وہ "ہاں ہوں" کر کے ٹال گیا۔ اس دن وہ ایک مہینے کے لگاتار اصرار کے بعد اسے اپنے ساتھ انارکلی لے

جانے میں کامیاب ہوئی تھی۔ اور انھوں نے جی بھر کر بنگالی کے رس گلّے اور چاٹ والے کی چاٹ اُڑائی تھی۔ بلکہ لگے ہاتھوں موہن کے پکوڑوں اور مٹر والے کے آلو دل کا بھی مزا لیا تھا۔ پھر ادمی کیلئے کپڑا بھی خریدا تھا۔ اور اون بھی مول لی تھی۔ اس کے علاوہ چھ پیسے درجن والے بلیڈ اور کالگیٹ کپ سوپ کی ایک دو آنے کی ٹکیہ بھی خریدی تھی۔ کئی دن سے اس کا شوہر پرانے کُند بلیڈوں کو شیشے کے گلاسوں میں تیز کر کے استعمال کر رہا تھا۔ نہانے والے صابن ہی سے حجامت بناتا تھا۔ اور شانتی نے اس کے روکنے پر بھی یہ دونوں چیزیں زبردستی خرید لی تھیں۔ یہ سب کچھ خرید کر دونوں خرچ کر سکنے کی مسرت کے احساس سے خوش خوش چلے آرہے تھے۔

[illegible] مہینہ تھا اور سوکھی سردی پڑ رہی تھی۔ شانتی نے اپنے سینے پر گرم شال کو بچے کے ارد گرد اچھی طرح لپیٹتے ہوئے کہا "نگوڑا سوکھا جاڑا پڑ رہا ہے سُنتی ہوں شہر میں بیماری پھیل رہی ہے"

لیکن اس کا شوہر چُپ چاپ اپنی دھوئیں کی تلخی سے منہ اور آنکھوں کو ملتا رہا۔

شانتی نے پھر کہا "ہماری اپنی گلی میں کئی لوگ بیمار ہو گئے ہیں۔ پرسوں بلنڈی چھاپ کا لڑکا نمونیہ سے مر گیا"

اس وقت شال میں لپٹا ہوا بچہ دوبارہ آہستہ آہستہ کھانسا۔ شانتی نے اسے اور بھی اچھی طرح شال میں لپیٹ لیا۔

اس کی بات کو اَن سنی کر کے اس کے شوہر نے کہا "آج بے حد بدپرہیزی کی ہے۔ پیٹ میں ابھی سے گڑبڑ ہو رہی ہے"

گھر آکر جب شانتی نے لڑکے کو چارپائی پر لٹایا اور پیشانی پر ہاتھ پھیرتے ہوئے اس کے بالوں کو پرے ہٹایا تو وہ چونک کر پیچھے ہٹی۔ اس نے خوف زدہ نگاہوں سے

اپنے شوہر کی طرف دیکھا، لیکن وہ سر کو دبائے نالی پر بیٹھا تھا۔

"ادمی کا ماتھا تو توے کی طرح تپ رہا ہے"، گلے کو بھر آنے سے روکتے ہوئے اس نے کہا۔

لیکن اس کے شوہر کو قے ہوئی۔

شانتی کا حلق رکنے سا لگا تھا اور اس کی آنکھیں پُرنم سی ہو گئی تھیں مگر اپنے شوہر کو قے کرتے دیکھ کر بچے کا خیال چھوڑ وہ اس کی طرف بھاگی۔ پانی لاکر اس کو کلی کرائی۔ نڈھال ہو کر وہ چارپائی پر دراز ہو گیا۔ کچھ لمحے بعد اسے پھر متلی ہوئی۔

شانتی کے ہاتھ پاؤں پھول گئے۔ گھر میں وہ تنہا تھی۔ ساس ماں پاس نہیں کوئی دوسرا رشتہ دار بھی نزدیک نہیں۔ اور نوکر رکھنے کی استطاعت کبھی ہوئی نہ تھی۔ ایک اُڑی اڑی سی نگاہ اس نے اپنے بخار سے تپتے ہوئے بچے اور بدہضمی سے نڈھال شوہر پر ڈالی۔ اچانک اسے گومتی کا خیال آیا۔ شانتی کبھی تنہا گلی میں نہ اتری تھی۔ لیکن بچا شرم کو چھوڑ وہ بھاگی بھاگی گلی میں گئی۔ گومتی اپنی گلی ہی میں اپنی کوٹھڑی کے باہر اینٹوں کے ایک چھوٹے سے پرشے کی اوٹ میں بیٹھی روٹیاں پکا رہی تھی۔ آگ کی روشنی میں اس کا کالا چہرہ دمک رہا تھا۔ شانتی نے دیکھا گومتی کا بڑا بھائی ابھی کھانا کھا کر اٹھا ہے۔ کچھ آگے بڑھ کر اس نے گومتی کو بلایا۔ توے کو نیچے اتارا اور لکڑی کو باہر کھینچ کر گومتی اسی طرح بھاگی آئی۔ نہایت عجز سے شانتی نے اپنی مصیبت کا مختصراً حال کہا اور اس سے درخواست کی کہ اپنے بڑے بھائی کو بھیج کر فوراً کسی ڈاکٹر کو بلوا دے۔ ان کی لانڈری کے پاس جس ڈاکٹر کی دکان ہے وہ سنا ہے پاس ہی لاج روڈ پر رہتا ہے۔ اگر وہ آجائے تو بہت ہی اچھا ہو اور ساڑھی کے پلو سے پانچ روپے کا ایک نوٹ کھول کر شانتی نے گومتی کے ہاتھ میں رکھ دیا اور کہا کہ فیس چاہے پہلے ہی کیوں نہ دینی پڑے لیکن بھائی سے کہنا کہ ڈاکٹر کو لے ضرور آئے۔ چلتے چلتے

اس نے یہ بھی درخواست کی کہ روٹی پکا کر اگر ممکن ہو تو تم بھی ذرا آجاتا۔ آدمی بھی . . .

یہ کہتے کہتے اس کا گلا رندھ گیا۔ گومتی نے کہا "آپ گھبرائیں نہیں۔ میں ابھی بھائی کو بھیجے دیتی ہوں۔ خود بھی ابھی آتی ہوں۔" اور یہ کہہ کر وہ بھاگتی ہوئی چلی گئی تھی۔

شانتی واپس آئی تو سیڑھیاں چڑھتے چڑھتے اس نے محسوس کیا کہ فکر اور اندیشے سے اس کے پاؤں کانپ رہے ہیں۔ اور اس کا دل دھک دھک کر رہا ہے۔

اوپر جا کر اس نے دیکھا کہ اس کا شوہر کوٹھے پر سے اتر رہا ہے۔ اس کے ہاتھ میں خالی لوٹا ہے۔ چہرہ پہلے سے بھی زرد ہو گیا ہے اور ماتھے سے پسینہ چھوٹ رہا ہے۔

شانتی کے اُڑے ہوئے رنگ کو دیکھ کر اس نے ہنسنے کی کوشش کی اور کہا "گھبراؤ نہیں سردیوں میں ہیضہ نہیں ہوتا۔"

شانتی نے پہلے سہارا دیکر شوہر کو بستر پر لٹایا۔ پھر نالی پر پانی گرایا اور پھر دوسرے کمرے میں بستر بچھا کر بچے کو اس پر لٹا آئی۔ اس وقت گومتی آگئی۔ کھانا تو سب کھا چکے تھے۔ اپنے حصے کا آٹا اٹھا کر، آگ بجھا کر وہ بھاگ آئی تھی۔

شانتی نے کہا "آدمی کو ادھر کمرے میں لٹا آئی ہوں۔ مجھے ڈر ہے اسے سردی نہ لگ گئی ہو۔ سانس مشکل سے آتا ہے اور کھانسی بڑھ گئی ہے۔ پچھلی کوٹھڑی میں پڑے ہوئے لحاف میں سے ذرا سا گودڑ لے آؤ۔ اور انگیٹھی میں کوئلے ڈال کر اس کی چھاتی کو روئی سے سینک دو۔ ان کے پیٹ میں گڑبڑ ہے۔ میں ادھر جاتی ہوں۔ کچھ نہیں تو گرم پانی کر کے بوتل ہی پھیرتی ہوں۔"

گومتی نے کہا "بی بی جی! انھیں کوئی ہاضمے کی چیز دو۔ ہمارے گھر تھوڑی سی اجوائن ہے۔ میں اس میں سے کچھ لیتی آتی ہوں۔ جب تک ڈاکٹر آئے ذرا گرم پانی سے وہی انھیں دے دو۔"

کسی ہچکچاہٹ کے بغیر شانتی نے میلی سی پُڑیا میں بندھی ہوئی کالی سی اجوائن

لے لی تھی اور گومتی انگیٹھی میں کوئلے ڈال کر روٹی لینے پیچھے بھاگ گئی تھی۔

باہر شام کی تاریکی بڑھ چکی تھی۔ وہیں کمرے کے اندھیرے میں بیٹھے بیٹھے شانتی کی آنکھوں میں تشویش اور بے چینی کے وہ سب رات دن پھر گئے۔ اس کے شوہر کو ہیضہ تو نہ تھا لیکن بدہضمی سخت قسم کی تھی۔ گومتی کے کہنے کے مطابق ڈاکٹر کے آنے تک شانتی نے اسے پینے کی اجوائن دیدی۔ پیاز بھی سنگھائی اور گومتی انگیٹھی اٹھا کر دوسرے کمرے میں بچے کے سینے کو روئی سے سینکنے کے لئے چلی گئی۔

ڈاکٹر کے آنے پر معلوم ہوگیا تھا کہ بچے کو نمونیہ ہوگیا ہے اور بے حد احتیاط کی ضرورت ہے۔

خاوند اور بچہ، دونوں کی بیک وقت تیمارداری کرنا شانتی کیلئے نہایت مشکل تھا۔ اس نے مجبوری کے انداز میں گومتی کی طرف دیکھا تھا لیکن اسے زبان ہلانے کی بھی ضرورت نہ پڑی تھی۔ بچے کی تیمارداری کا تمام بار گومتی نے اپنے اوپر لے لیا تھا۔ شانتی کو معلوم بھی نہ ہوا تھا کہ وہ کب گھر جاتی ہے؟ کب گھر والوں کو کھانا کھلاتی ہے، خود کھاتی ہے، یا کھاتی بھی ہے کہ نہیں؟ اس نے جب دیکھا اسے سایہ کی طرح بچے کے پاس پایا۔ کئی دن تک ایک ہی وقت کھا کر اور کھانا پکانے کا کام اپنی بوڑھی ادی کو سونپ کر گومتی نے بچے کی تیمارداری کی تھی۔

دوپہر کا وقت تھا۔ اس کا شوہر دکان پر گیا ہوا تھا۔ ادمی کو بھی اب آرام تھا۔ اور وہ چارپائی پر اس کی چھاتی سے لگا سو رہا تھا۔ پاس ہی فرش پر ٹاٹ بچھائے گومتی پرانے اون کے دھاگوں سے سوئٹر بننا سیکھ رہی تھی۔ اتنے دنوں کی تھکی ہاری نیند کی ماری شانتی کی پلکیں دھیرے دھیرے بند ہو رہی تھیں۔ آخر وہ اسی طرح پڑی پڑی

سو گئی۔ جب وہ جاگی تو اس نے دیکھا آومی رو رہا ہے اور گومتی اسے بڑے پیار سے سُریلی آواز میں تھپک تھپک کر لوری دے رہی ہے۔ شانتی نے پھر آنکھیں بند کر لیں۔ اس نے سنا گومتی آہستہ آہستہ گا رہی ہے

آری ککو، جا ری ککو جنگل پکو بیر
بھیا ہا سے ڈھیلا چڑیا اڑے جا

اور پھر

آری چڑیا دو پیڑا پکا ئے جا
بھیا ہا سے ڈھیلا چڑیا اڑے جا

بچہ چُپ ہو گیا تھا۔ لوری ختم کر کے اس نے بچے کو گلے سے لگا کر چوم لیا۔ شانتی کی نیم وا آنکھوں نے دیکھا بچے کے پیلے زرد سے چہرے پر گومتی کا صحت ور کالا منہ جھکا ہوا ہے۔ شکھ کے آنسو اس کی آنکھوں میں اُمڈ آئے۔ اس نے اٹھ کر گومتی سے بچے کو لے لیا۔ اور جب وہ پھر ٹاٹ پر بیٹھنے لگی تو دوسرے ہاتھ سے اس نے گومتی کا ہاتھ پکڑ کر چارپائی پر بٹھاتے ہوئے اسے اپنے بازو سے باندھ لیا تھا اور کہا تھا ”آج سے تم میری بہن ہوئیں گومتی!“

آنکھیں بند کئے ہوئے شانتی ماضی کے انھیں مناظر میں گم تھی۔ اس کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے کہ اچانک اس کا شوہر اندر داخل ہوا۔ کسی زمانہ میں لانڈری کا کام کرنے والے اور وقت پڑنے پر خود اپنے ہاتھ سے استری تک گرم کرنے میں بھی جھجک نہ محسوس کرنے والے لالہ دین دیال اور لاہور کی مشہور فرم ”دین دیال اینڈ سنز“ کے مالک اور مشہور شیئر بروکر رائے صاحب لالہ دین دیال میں زمین آسمان کا فرق تھا۔ اس دس برس کے عرصے میں ان کے بال کافی پک گئے تھے، جسم زیادہ موٹا ہو گیا تھا اور ڈھیلے ڈھالے کپڑوں کی

جگہ اب انھوں نے نہایت اعلیٰ ریشمی کپڑے کا عمدہ سوٹ اور پاؤں میں سفید ریشمی جرابیں اور کالے ہلکے سینڈل پہن رکھے تھے۔

شانتی نے جھٹ رومال سے آنکھیں پونچھ لیں۔

بجلی کا بٹن دباتے ہوئے انھوں نے کہا "یہ تاریکی میں کیوں پڑی ہو۔ اٹھو، ذرا باہر باغ میں گھومو پھرو" اور پھر بولے "اندرانی کا فون آیا تھا کہ بہن اگر چاہیں تو آج سینما دیکھا جائے"

"بہن" دل ہی دل میں شانتی غم اور طنز سے مسکرائی اور اس کے سامنے ایک اور کالی کلوٹی سی لڑکی کی تصویر کھنچ گئی جسے کبھی اس نے "بہن" کہا تھا۔ لیکن بظاہر اس نے صرف اتنا کہا "میری طبیعت ٹھیک نہیں"

منہ پھلائے ہوئے رائے صاحب باہر چلے گئے۔

تب آنکھوں کو پھر ایک بار پونچھ کر اور رفتار سے سنبھل کر شانتی میز کے پاس آئی اور کرسی پر بیٹھ کر پیڈ کو اپنی طرف کھسکا کر اس نے لکھا:۔

بہن گومتی!

تمھاری بہن اب بڑی ہو گئی ہے۔ بڑے آدمی کی بیوی ہے۔ بڑے آدمیوں کی بیویاں اب اس کی بہنیں ہیں۔ پنجرے میں بند پنچھی کو کب اجازت ہوتی ہے کہ آسمان میں اڑنے والے آزاد ہمجولیوں سے مل سکے؟ میں نے تمہیں پھر آنے کیلئے کہا تھا لیکن اب تم کل نہ آنا۔ اپنی اس بے بس بہن کو بھولنے کی کوشش کرنا۔

"شانتی"

اس بار اس نے ایک سطر بھی نہیں کاٹی اور نہ کاغذ ہی پھاڑا، ہاں لکھتے لکھتے بھر آنکھیں بھر آنے سے جو ایک دو آنسوؤں کی بوندیں خط پر گریں انھیں اس نے بلاٹنگ سے

سکھا دیا تھا۔ پھر خط کو لفافہ میں بند کر کے اس نے نوکر کو آواز دی۔ اور اس کے ہاتھ میں لفافہ دیکر کہا کہ منی لال اسٹریٹ میں مندر کے پجاری کی لڑکی گومتی کو دے آئے۔ اور پھر سمجھاتے ہوئے کہا "گومتی کچھ ہی دن ہوئے اپنی سسرال سے آئی ہے۔"

نوکر خط لیکر چلا ہی تھا کہ شانتی نے اسے پھر آواز دی اور خط اس کے ہاتھ سے لیکر پھاڑ ڈالا۔ پھر آہستہ سے اس نے کہا۔ تم گومتی سے کہنا کہ بی بی اچانک آج میکے جا رہی ہیں اور دو مہینے تک واپس نہ آئیں گی۔

یہ کہہ کر وہ پھر کھڑکی میں جا کھڑی ہوئی اور آسمان سے اترتے ہوئے اندھیرے کو دیکھنے لگی۔

بات اتنی ہی تھی کہ آج دوپہر کو جب وہ برج کھیل رہے تھے تو نوکر نے آکر خبر دی تھی کہ منی لال اسٹریٹ کے پجاری کی لڑکی گومتی آئی ہے۔ یہ سنتے ہی کھیل کو ادھورا چھوڑ کر اور یہ بھول کر کہ اس کے پارٹنر رائے صاحب لالہ بہاری لال ہیں وہ بھاگ گئی تھی اور اس نے گومتی کو اپنے بازوؤں میں کھینچ لیا تھا اور پھر وہ آپس میں دکھ سکھ کی باتیں کرتی رہی تھیں۔ شانتی کو معلوم ہو گیا تھا کہ جب گومتی کا شوہر کام کرنے لگا تو اسے آکر لے گیا تھا۔ اور ان دس سالوں میں اس نے گومتی کو چار بچوں کی ماں بھی بنا دیا تھا۔ گومتی نے اوٹی کا اور دوسرے بچوں کا حال پوچھا اور جا تا تھا۔

اس دوران میں رائے صاحب کئی بار بلانے آئے تھے لیکن وہ نہ گئی تھی اور جب دوسرے دن پھر آنے کا وعدہ لیکر اس نے گومتی کو رخصت کیا تھا تو اس کے شوہر نے آکر کہا تھا "تمہیں شرم نہیں آتی۔ اس اجڈ اور گنوار عورت کے ساتھ اتنی دیر تک بیٹھی رہیں تمہیں میری عزت کا ذرا بھی خیال نہیں۔ اسے بغل میں لیکر ان سب کے سامنے سے گذر گئیں۔" رائے صاحب اور ان کی بیوی ہنسنے لگے اور آخر انتظار کر کے

چلے گئے....

اس کے بعد اس کے شوہر نے اور بہت کچھ کہا تھا۔ لیکن شانتی نے فیصلہ کر لیا تھا کہ قفس کو قفس ہی سمجھے گی اور اُڑنے کی کوشش نہ کرے گی۔

کالو

کالو کا رنگ، شاید یہ کہنے کی ضرورت نہیں، کالا تھا، کالا — جس کے ساتھ سیاہ کا اسمِ صفت بھی لگا دیتے ہیں۔ اس کی آنکھوں کا رنگ شربتی تھا۔ اور گہری بھوری پتلیوں کی جگہ اس کی آنکھوں میں ہلکی نیلی مٹیالے آسمان کے سے رنگ کی پتلیاں ٹمٹمایا کرتی تھیں، ٹمٹماتی ہی تھیں، دمکتی نہ تھیں۔ جس طرح کہ دوسری صحت مند آنکھوں میں دمکا کرتی ہیں۔ کیونکہ وہ مادر زاد اندھا تھا۔

ہاں وہ اندھا تھا۔ لیکن اندھوں کا سا کتری کا جذبہ اس میں یکسر مفقود تھا۔ اونچا لمبا قد، کھلے سڈول اعضا، گٹھا ہوا جسم اور خوبخوار شکل و صورت! جب وہ لیٹا ہوتا تو کسی دشمن کی کیا مجال کہ اس کے پاس سے غرّاہٹ سنے بغیر گذر جائے۔ مجھے تو بہت دیر تک اس بات کا بھی پتہ نہیں لگا کہ وہ اندھا ہے — بالکل، دونوں

آنکھوں سے اندھا تھا۔

آج اگرچہ میری عمر تیس برس کے قریب ہونے کو آئی ہے اور ہندوستان جنت نشان میں، جہاں اوسط آدمی کی عمر تیس برس کی ہے۔ ۳۰ سال کا ہو جانا پختہ عمر ہو جانے کے مترادف ہے، لیکن اس کے باوجود مجھ میں اب تک بچپن کی کچھ عادتیں بدستور موجود ہیں۔ اسی عادت کو لیجئے ـــــ کھانا کھانے کے بعد، جہاں دوسرے لوگ مشترکہ ڈائننگ ہال سے کھانا کھا چکنے کے بعد طشتریاں مناسب جگہ رکھ کر ہاتھ دھونے کیلئے جلدی جلدی قدم بڑھاتے ہیں، میں اپنی طشتری سے بچی ہوئی روٹی اٹھا کر کووں اور کتوں کو اکٹھا کر لیتا ہوں۔

اور پھر وہ ایک ڈیڑھ روٹی ایک دم کووں اور کتوں میں ڈال میں اپنے کام میں مصروف نہیں ہو جاتا۔ یہ سب میں کارِ ثواب یا پُن کا کام سمجھ کر نہیں کرتا۔ مجھے ایسا کرنے میں لطف حاصل ہوتا ہے۔ روٹی کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے کر کے ہوا میں اچھالتا ہوں۔ اور اگر کوئی چنچل کوا ہوا میں سے ہی اسے دبوچ لے یا کوئی شوخ کتا زمین پر گرنے سے پہلے ہی اسے لپک لے تو مجھے لاانتہا مسرت ہوتی ہے۔ بچپن کے باہر جب کھانے کے بعد پانی یا لسی کا ٹھنڈا گلاس پینے کی وجہ سے جسم میں سردی کی جھرجھری سی اٹھتی ہے، تو وہی ایک ڈیڑھ روٹی کا ٹکڑا لیکر میں باہر دھوپ میں جا کھڑا ہوتا ہوں۔ اور اپنے بچپن کی عادت کو پورا کرنے کے ساتھ ساتھ میٹھی گرم دھوپ کا مزا بھی لے لیتا ہوں۔

سامنے حنا کی باڑ کے بڑے پت جھڑ کی وجہ سے انار کی سوکھی شاخوں پر سردی سے بچنے کیلئے اپنے پروں کو پھلائے سکڑی سی بیٹھی کوئی بلبل یا چڑیا ہمیشہ یہ تماشہ دیکھا کرتی ہے۔ اور گیہوں کے چھوٹے سے کھیت کے پرے اپنے جوڑے جوڑے پتوں

شٹالا اور ننھے ننھے پتوں کو لئے ہوئے کالی سینجی دھوپ میں کھل رہی ہوتی ہے ـــــ بنڈھوں پر لگے ہوئے سرسوں کے پیلے اور موٹھ کے نیلاہٹ لئے ہوئے سفید پھول اُچک اُچک کر تاکا کرتے ہیں۔ اور دھوپ اس ڈائننگ ہال کو، اس کے ارد گرد سبزی کے کھیتوں کو، ان سے پرے کراہ سے ہموار ہوتی ہوئی زمین کو، اور پھر بنجر میں تنہا کھڑے ببول کے درخت کو اور حدِ نظر کے پاس آموں کے گھنے باغ کو اپنی آغوش میں لئے ہوئے ہوتی ہے۔ اور میں اس نکھری، گرم میٹھی، پیار بھری دھوپ میں روٹی کے ٹکڑے اُچھالا کرتا ہوں۔

جس طرح مُردار سے گدھ کا تعلق ہے، اسی طرح انسان سے کتوں کا۔ کسی ویرانے میں، جہاں دور دور تک درختوں کا نشان نہ ہو، کوئی نعش پھینک دیجئے، دوسرے دن ہی اپنی لمبی گردنیں بڑھائے، چیختے جھپٹتے گدھ اس کے ارد گرد اکٹھے ہو جائیں گے۔ یہی حال کتوں کا ہے۔ کسی بنجر میں کُٹیا ڈال کر انسان روٹی بنانا شروع کر دے کچھ ہی دنوں کے بعد اسے اپنی رسوئی کے باہر ایک دوسرے کو بھونکتے، نوچتے غراتے کتوں کی آواز سنائی دینے لگے گی۔

میں بھی جب پریت نگر میں آیا تھا، یہاں ایک بھی کتا نہ تھا۔ لیکن اب میں روز اپنے ارد گرد کتوں کی ایک فوج دیکھتا ہوں۔ وہ ویرو کے کا شیر، جس کا رنگ بھورا ہے۔ صرف گردن پر سفیدی ہے اور جس کی بھوری پیشانی پر ایک سفید سا تلک ہے۔ اور جس کی آنکھوں کے ڈھیلوں کے ارد گرد ہلکا گلابی رنگ ہے، اور اگر میں خاص کوشش نہ کروں تو کتے تک کو لقمہ اٹھانے نہیں دیتا۔ اور وہ چتکبرا ڈگ ـــــ جو شاید چک مصری خاں سے آیا تھا ـــــ جس کی پچھلی ٹانگوں پر دُم کے نیچے لمبے لمبے بال گھٹنوں تک چلے گئے ہیں۔ اور جو بارہا اس ویرو کے کے شیر سے لوہا منوا لیتا ہے، اور وہ سفید جسم پر بھورے داغ، نقش و نگاری پر سیاہی

اور بھوری پتلیوں والا کتا جو خونخواری میں ان سے کسی طرح کم نہیں اور وہ چھوٹا سا بلّو، جسے سردار تخت سنگھ کے پیار نے یہ نام دے دیا ہے۔ پھرتیلا، چھوٹے کھڑے پان سے کانوں اور لمبی پتلی تھوتنی والا، جس کے آباؤ اجداد ضرور ہی لومڑی کی کسی نسل سے ہوں گے۔ اور وہ انگریزی نژاد "مکی"، جسے ایک عیسائی ماسٹر صاحب لائے تھے۔ اور جو ان دیسی کتوں کے ساتھ مل کر ان سا ہی آوارہ ہو گیا ہے اور وہ دُم کو پیٹ کے ساتھ لگائے، محراب سا بنا پرے پرے ہی پھرنے والا کتا، جس کی بھوک معلوم ہوتا ہے خوشبو سے ہی مٹ جاتی ہے، اور وہ کُتیا جو اپنے پیٹ میں سات آٹھ بچّوں کا بوجھ اٹھائے پھرتی ہے اور جس کی بھوک روز بروز بڑھتی جاتی ہے۔ یہ سب اور کئی دوسرے میرے اردگرد اکٹھے ہو جاتے ہیں۔

انہی میں وہ کتا کالا سیاہ، جیسا کہ میں نے کہا۔ صرف اس کے پنجے ٹخنوں تک چتکبرے تھے اور گھٹنوں پر ہلکی سی سفیدی تھی۔ طاقت میں وہ اس دیرو کے بھیڑیئے سے کم نہ تھا۔ اور ان سب کتوں میں جلد ہی مجھے اس سے دلچسپی ہو گئی تھی۔ میں نے دیکھا کہ وہ روٹی کو اوپر نہ جھپٹ سکتا تھا۔ لیکن اگر میں روٹی دھرتی پر پھینک دوں تو اس کی آواز پر لپکتا تھا۔ اور کسی میں اتنی جرأت نہ ہوتی تھی کہ اسے اٹھا کر لے جائے۔ لیکن جب میں روٹی نہ پھینکتا، بلکہ انہی کتوں کی طرف پھینکتا جو انھیں اُچک کر جھپٹ سکیں تو وہ چپ میرے پاس کھڑا دُم ہلاتا اور اپنی مٹیالی نیلی پتلیوں کو پھراتا ہوا میری طرف ایسی آنکھوں سے دیکھتا کہ میرے من میں کچھ رحم سا پیدا ہو جاتا اور میں اپنے تماشے کو چھوڑ کر، ساری کی ساری روٹی اس کے آگے پھینک کر بمبیپر ہاتھ دھونے اور منہ صاف کرنے چلا جاتا۔ سوچا کرتا کہ یہ کیوں دوسروں کی طرح اچک کر روٹی نہیں لیتا۔ اور ایک دن جب وہ دھوپ میں برامدہ کی دیوار کے سہارے چاروں ٹانگیں اوپر کر کے لیٹا ہوا تھا میں نے یہی بات بچن کے ہیڈ رسوئیے سے

بھی پوچھی۔

"کون، یہ سورداس؟" کچن کی کھڑکی سے موہن سنگھ نے جھانک کر پوچھا۔

"سورداس!"

"ہاں جی، یہ بالکل اندھا ہے"

اور یہ کہتا ہوا موہن سنگھ کھڑکی کے باہر کود آیا۔

اس کی آواز کو سن کر یا اس کے رسوئی کی خوشبو میں بسے ہوئے کپڑوں کی بو پا کر کالو کروٹ کے بل اچھل کر اس کے پاس آ کھڑا ہوا۔ اور دُم ہلانے لگا۔ اور اس کے ڈھیلوں کی مٹیالی نیلی پتلیاں ٹمٹمانے لگیں۔

تبھی وہ چک ہری خاں کا ڈگ بھی وہاں آ پہنچا۔ اس کی بو پا کر کالو غرّایا۔

موہن سنگھ نے اس کی پیٹھ کو تھپ تھپا کر کہا "بس بچہ"

اور کالو لپکا۔

"پچ پچ۔ بس بچہ بس"

اور کالو ڈگ کے سر پر جا سوار ہوا۔

"شر کتا ہے بابو جی" موہن سنگھ نے اپنی کھچڑی سی داڑھی پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا "اندھا تو ہے پر شہ دو تو شیر سے لڑ جائے"

لیکن یہ شیر سے لڑنے والا کالو اپنے سینے میں ایک نہایت نازک دل رکھتا ہے اس کا مجھے بعد میں پتہ چلا۔ جب پانچ چھ ماہ کے بعد میں نے اسے پنکی کے ساتھ ساتھ یا اس کے پیچھے پیچھے گھومتے دیکھا۔

پنکی ایک چھوٹی سی کتیا تھی۔ قد چھوٹا ہونے کی وجہ سے شاید بچوں نے اسے

یہ تام دیدیا تھا۔ پتلی سی تھوتھنی، چست کھڑے کان، ہلکا بھورا سفیدی مائل رنگ کانوں کے پاس بال لمبے اور ملائم تھے۔ ایک دن صبح صبح مجھے اس کے پیچھے سردی میں بڑی دور تک بھاگنا پڑا تھا۔ درحقیقت بات کچھ ایسی نہ تھی۔ میں اکیلا آدمی ہوں کہنے کا مطلب یہ کہ میرے بیوی نہیں، کئی برس ہوئے اس کا انتقال ہو گیا تھا۔ اور اس تنہائی کی زندگی نے کئی وجوہات سے چھوٹی چھوٹی چیزوں کی قیمت میرے نزدیک بہت بڑھا دی ہے۔ صبح جب ورزش کر چکتا ہوں تو مجھے تیز بھوک لگتی ہے بھوک، شاید مناسب لفظ نہیں ———— ایک عجیب طرح کی چاہ سی میرے دل میں بیدار ہو جاتی ہے ———— گرم گرم دودھ کیلئے۔ اور بار ہا میں ہاتھ میں کھانڈ کی پڑیا، ڈبل روٹی کے ایک دو ٹکڑے رس یا چلغوزے لیکر کچن میں چلا جاتا ہوں۔ رسوئیے سے ڈیڑھ پاؤ یا آدھ سیر گرم گرم دودھ لے لیتا ہوں، اور پھر اس وسیع ڈائننگ ہال کے پچھلی طرف برآمدے میں، کھلی ہوئی دھوپ میں بیٹھ کر، رس بھگو بھگو کر کھاتا ہوں۔ یا چلغوزے چٹختا اور زیادہ گرم ہونے کی وجہ سے ایک ایک چمچہ دودھ پھونک مار مار کر پیتا ہوں۔ یا سامنے گوبھی، شلجم یا گاجروں کی کیاریوں میں سردی کی طرف سے بے پرواہ مالی رام کو ہمیشہ کام کرتے دیکھتا ہوں۔ اور ساتھ ساتھ دودھ پیتا رہتا ہوں۔

لیکن گذشتہ سال سردی کچھ زیادہ پڑی تھی، پکی دیواروں کو پار کر کے اندر گھس آتی تھی۔ لحاف، جو اندر سے جسم کی حرارت کی وجہ سے گرم ہو جاتا اوپر سے برف جیسا ٹھنڈا ہو جاتا۔ میں ان دنوں صبح دودھ پینے کے لئے کچن نہ جاتا۔ دھوپ ہی نہ نکلتی تھی۔ بارہ بارہ بجے تک دھند چھائی رہتی تھی۔ تندگار اسنگھ جب گرم گرم دودھ کی بالٹی لیکر کوٹھی کو ٹھی دیتا ہوا آتا تو میں اسی سے لے لیتا۔

چونکہ سردی زیادہ پڑنے لگی تھی۔ اس لئے میں نے ورزش کی مقدار بھی کچھ زیادہ

بڑھا دی تھی اور گرم گرم دودھ کیلئے وہ چاہ سی بھی میرے من میں بے حد زیادہ ہو گئی تھی۔ اور چلغوزے اور رس مجھے کسی نعمت سے کم نہ دکھائی دیتے تھے۔

ان چار چھ آنے پاؤنڈ والے رسوں کو میں نے پہلے کبھی دیکھنا بھی پسند نہ کیا تھا اور چلغوزوں سے بھی مجھے نفرت سی رہی ہے۔ ہضم ہی نہیں ہوتے ۔۔ میں ایسا سمجھتا آ رہا ہوں لیکن کبھی صحت ایسی بھی ہوتی ہے کہ معدہ پتھر تک ہضم کر جاتا ہے۔ پر یت نگر لاہور سے تیس میل اور پکی سڑک سے دس میل دور دیہات میں بس رہا ہے۔ کھانا تو خیر جو کھانا چاہیں، کمیونٹی کچن میں کھا سکتے ہیں۔ لیکن اور چیزیں وہاں اسٹور میں ملتی ہیں۔ اور جب وہ ختم ہو جاتی ہیں تو کبھی کبھی انتظار بھی کرنا پڑتا ہے۔ بیویوں والے تو گاجر کا حلوہ، دال کے لڈو، برفی، بیسن اور بیسیوں چیزیں بنا چھوڑتے ہیں، لیکن میں ٹھیرا اکیلا، اس لئے میرے نزدیک رس ہی مٹھائی اور پیاری چیزیں گنے تھے اور پھر تنہائی اور مصیبت کی وجہ سے مجھے دنوں تاریخوں اور وقت کا بھی پتہ نہیں رہتا اور جب کوئی چیز ختم ہو جاتی ہے تو اسے لانا مجھے اسی وقت یاد آتا ہے جب کہ بار ہا اسٹور بند ہو چکتا ہے۔ اور اکثر جب کھلا ہوتا ہے تو وہاں جانے پر پتہ چلتا ہے کہ چیز تو بہت پہلے کی ختم ہو گئی ہے۔ اس لئے میں زیادہ ضرورت کی چیزیں اکٹھی لے رکھتا ہوں اور ان بے حد ضروری چیزوں میں رسوں اور چلغوزوں کا نمبر سب سے پہلے آتا ہے۔

اس دن چلغوزے ختم ہو چکے تھے اور شاید مہینے کے آخری دن ہونے کی وجہ سے اسٹور میں بھی ختم ہی تھے، اس لئے میں رسوں پر ہی، ان میں سے بھی دو کی جگہ ایک پر ہی صبر کر لیا کرتا تھا۔

شنکارا سنگھ دودھ لیکر آ گیا۔ میں نے ابھی مشکل سے ہی ورزش ختم کی تھی۔ میں نے رسوں کا لفافہ نکالا لیکن اس وقت مجھے خیال آیا کہ مسواک تو میں نے کیا ہی نہیں، غسل کئے بغیر میں خواہ کچھ کھا لوں لیکن مسواک کئے بغیر کوئی چیز نگلنا میرے لئے مشکل

ہو جاتا ہے۔ پھر خیال آیا کہ مسواک لینے جاؤں گا تو دودھ ٹھنڈا ہو جائیگا۔ اور میرے پاس نہ ہیٹر پاس ہے نہ اسٹوو، تب میں نے فیصلہ کیا کہ چلو آج برش ہی کیا جائے اور یہ فیصلہ کرتے ہی لفافہ وہیں چھوڑ، دودھ کا گلاس ہاتھ ہی میں لئے غسل خانے میں چلا آیا۔

گلاس کھڑکی میں رکھ کر میں برش کرنے لگا۔ برش کرنے کے بعد مجھے پتہ چلا کہ زبان صاف کرنیوالا (ٹنگ سکریپر) تو وہیں کمرے میں چھوڑ آیا ہوں، اور میں کمرے کی طرف بڑھا۔ اسی وقت مجھے کچھ گرنے کی آواز آئی۔ دیکھا تو وہ بلی چق اٹھا کر دروازہ کھول کر اندر آگئی تھی اور اس نے کھلی الماری میں سے رسوں کا لفافہ نیچے گرا لیا تھا۔ کئی رس ٹوٹ گئے تھے۔ اور فرش رسوں کے چورے کی وجہ سے گندا ہو گیا تھا۔ ٹنگ اسکریپر کو وہیں الماری میں پھینک میں نے رس اٹھائے اور انھیں لفافہ میں ڈال کر الماری کے سب سے اوپر کے خانہ میں رکھا۔ پھر چورے کو اٹھا کر باہر پھینکا۔ اور فرش صاف کر کے ٹنگ اسکریپر اٹھا کر دروازہ کی چٹخنی لگا کر غسل خانہ کی طرف بڑھا۔ دروازہ سے ہی مجھے لپر لپر کی آواز آئی۔ دیکھتا کیا ہوں کہ وہی کمبخت بلی کھڑکی میں رکھے ہوئے گلاس میں لپر لپر زبان چلا رہی ہے۔ (غسل خانہ کا دروازہ کھلا تھا اور یقیناً وہ اسی طرف سے آگئی تھی)

غصہ سے میری آنکھوں سے چنگاریاں نکلنے لگیں۔ چپل اتار کر میں نے اس کے دے ماری، اس کے تو نہ لگی، البتہ دودھ کا گلاس پھر رسے فرش پر آ رہا۔ غصہ سے اندھا ہو کر میں بلی کے پیچھے باہر کو بھاگا۔ بھاگتے بھاگتے میں نے دوسری چپل بھی ہاتھ میں لے لی۔ اور میں بھول گیا کہ باہر کہرا جما ہوا ہے۔

دراصل اس بلی سے مجھے اور بھی شکایت تھی۔ کچھ دنوں سے میرے کمرے کے پیچھے اس نے بچے دے رکھے تھے اور پلوں کی چیاؤں چیاؤں کی وجہ سے میری دوپہری نیند ہی حرام ہو جاتی تھی۔ اور پھر باہر خنکی زیادہ ہونے کی وجہ سے وہ اپنے پلوں کو لیکر میرے

برامدے میں آجاتی تھی۔ جس دن غلطی سے پائدان باہر رہ جاتا اس دن وہ سب پلّے اس پر آ سوتے اور کبھی بار اسے گندا کر جاتے۔

میں دانت پیستا ہوا اندھا دھند اس کے پیچھے بھاگا جا رہا تھا۔ بچوں کی پیدائش اور اپنی بڑھی ہوئی بھوک کو پورے طور پر نہ مٹا سکنے کی وجہ سے وہ کچھ کمزور اور ناتوان ہو گئی تھی لیکن جان کے خوف سے چاؤں چاؤں کرتی ہوئی دُم کو پیٹ سے لگائے بھاگی جا رہی تھی۔ میرے پاؤں شل ہو رہے تھے۔ تیکھی ٹھنڈی ہوا سے میری ناک کی کوٹھی درد کرنے لگی تھی۔ اور کانوں کے کناروں پر چیونٹیاں سی چل رہی تھیں۔ لیکن میں انتقام کے اندھے جذبہ کے ماتحت بھاگا جا رہا تھا۔ کئی لان، کھیت، میدان پار کر کے وہ چکر کھا کر وہیں اپنے بچوں کے پاس آ کر دیوار سے دبک گئی۔ ہاتھ میں اٹھائی ہوئی چپل میں نے زور سے اس کے دے ماری۔۔۔ ایک چاؤں کر کے اس نے پیٹ دکھا دیا اور چاروں ٹانگیں اوپر کی طرف کر دیں۔

میں نے دوسری بار وار کرنے کیلئے چپّل اٹھائی تھی لیکن اس کی عاجزی کو دیکھ کر میں اسے ہاتھ میں ہی لئے ہوئے مُڑ آیا۔

اسی بڈھی سے کالو کو محبت ہو گئی۔

اور کالو کا عشق کسی نوجوان کا بے پروا عشق نہ تھا۔ بلکہ اس ادھیڑ کا عشق تھا جس نے اس پختہ عمری تک اس کا مزا نہ چکھا ہو۔ اس عمر کے عشق میں نوجوان عشق کی سی بے پروائی، ہرجائی پن اور بیوفائی نہیں ہوتی۔

کالو اندھا تھا کسی مدھ ماتی کی رفاقت اسے آج تک حاصل نہ ہوئی تھی جب بھی موسم بدلتا اور کوئی رفیقہ اپنے ساتھیوں سے کھیلتے، ان کے جسموں کو سونگھتے، یا ان کی گردنوں میں اپنے اگلے پنجے ڈال کر کھڑے ہونے میں لطف حاصل کرنے لگتی تو پھر پانچ یا پانچ چھ چھ

دن تک چک ہری خاں سے لیکر ویر و کے، لوہو کے یہاں تک کہ بھیلو وال تک کے کتے اس کے پیچھے چلنے لگتے۔ جہاں وہ جاتی تو وہاں وہ جاتے، ان کے آگے آگے ہمیشہ وہ ویرو کے کا شیرا یا وہ چک ہری خاں کا ڈگ یا پھر وہ سفید رنگ لیکن خونخوار تھوتھنی والا کتا ہوتا۔ اور ان کا کام اپنے پیچھے آنیوالوں کو آگے بڑھنے سے اپنی محبوبہ کے جسم کو چھونے کی کوشش کرنے سے روکنا ہوتا۔

کالو نے عرصہ سے ان مہموں پر جانا چھوڑ رکھا تھا۔ بہار میں آئی ہوئی سا تھنوں کی چال میں کچھ عجیب طرح کی مستی، کچھ عجیب طرح کی تیزی آجاتی تھی۔ یہ جان کر کہ یہ سب فوج کی فوج ان کے چاہنے والوں کی ہے وہ مست البیلی چال سے چلتیں۔ اندھا کالو ان کا ساتھ نہ دے سکتا۔ اسے سونگھ سونگھ کر چلنا ہوتا۔ اسی طرح ایک بار جسم کی ضرورتوں سے مجبور ہو کر صرف بُو کے سہارے بھاگتا ہوا وہ گڑھے میں جا گرا تھا۔ سارا دن وہ پانی میں کھڑا چیختا رہا۔ رات کے سناٹے میں جب اس کی پُرسوز چیخیں موہن سنگھ تک پہنچی تھیں تو اس نے اسے نکالا تھا۔ پانی اتنا گہرا نہیں تھا ورنہ وہ اسی دن ختم ہو گیا ہوتا۔

وہ ڈائننگ ہال کے پچھلی طرف برامدہ میں پڑا دھوپ سینکتا، کھانے کے وقت چھین جھپٹ کر اپنا پیٹ بھر لیتا۔ (اور یوں بھی کچن کا ہیڈ رسوئیا اسے بیٹا کہہ کر پکارتا تھا۔ اور کھانے کی اتنی فکر اسے نہ ہو سکتی تھی) اور رات کو تندور کے نیچے گرم راکھ میں پڑ کر سو رہتا۔ اس کی اس جگہ کو چھیننے کی ہمت ابھی اس کے دوستوں میں سے کسی میں نہ تھی۔

لیکن گذشتہ بہار میں جب موسم بدلا۔ اور سرسوں کے پھولوں سے کھیت پیلے ہو گئے گیہوں کو بالیاں لگ آئیں۔ آموں کے بور سے ہواؤں میں خوشبو بکھر گئی۔ اور روز ادیر سے پھلنے والی بیریاں آنولوں کی شکل کے بڑے بڑے بیروں کے بوجھ سے دھرتی کے ساتھ جا لگیں تو ٹیپی (جیسا کہ دیہاتی زبان میں کہا جاتا ہے) لگ میں آگئی۔ مستا گئی۔

دراصل ٹیپی کسی کی پالی ہوئی تو تھی نہیں، اور آوارہ کتوں میں مادہ سال میں دو

دو تین تین بار بھی پھل آئی ہے۔ اس کا جسم بھر گیا تھا۔ بالوں میں چمک آ گئی تھی۔ کالوں کے بال زیادہ ملائم لگنے لگے تھے۔ اور چک مصری خاں، ویروکے اور لولپو کے کتوں میں جنگ ہونے لگی تھی۔

انہی دنوں میں، جب ایک رات وہ تنور نما گڑھے میں (جس کا سوراخ اس کے بار بار گھس کر بیٹھنے سے کھلا ہو گیا تھا) سوراخ کے پاس اپنے اگلے پنجوں پر تھوتھنی رکھے اونگھ رہا تھا (دن کو شاید زیادہ سویا تھا یا ابھی رات زیادہ نہ گئی تھی) کہ اس کی ناک میں کچھ ایسی بو آئی کہ اس کے اعصاب تن گئے۔ اس نے ہوا میں پھر ایک بار سونگھا اور ایک سنسنی سی اس کے جسم میں دوڑ گئی۔ وہاں بیٹھے رہنا اس کیلئے مشکل ہو گیا۔ اپنی آنکھوں کی کمی اور اس کمی کی وجہ سے گڑھے میں گر پڑنا اسے بھول گیا۔ وہ اٹھنے لگا لیکن تبھی اسے اچانک اس غار کے باہر اپنے ساتھیوں کی بھوں بھوں اور پیخ پیخ کی آواز سنائی دی اور وہ مدبھری خوشبو اسے اور بھی پاس، اور بھی نزدیک آتی محسوس ہوئی۔ دوسرے لمحے اس نے گرم گرم سانس اپنی ناک پر محسوس کی۔ پنکی باہر کی خنکی اور اپنے رقیبوں کی جارحانہ کوششوں سے تنگ آ کر اس سوراخ میں گھس آئی تھی۔

ویروکے کے شیرے نے اس کے پیچھے جانے کی کوشش کی لیکن کالو کی ایک ہی "بخ" نے اس کی تھوتھنی کا گوشت نوچ لیا۔

ادھر سے ہٹ کر پنکی کیلئے کچھ جگہ بنا دی اور خود دہانہ پر ڈٹ کر بیٹھ گیا۔

رات کی سخت سردی نے کتوں کی گرمی کو بھی ٹھنڈا کر دیا۔ اور وہ اونچے اونچے چیختے ہوئے پناہ گاہوں میں بھاگ گئے۔ اور کالو پنکی کے ساتھ سٹ کر بیٹھ گیا۔ ہوا میں) بار بار سونگھنے لگا۔ اور ہر سانس اس کے جسم میں آنند کی وہ لہر دوڑانے لگا جس سے وہ اب تک بے بہرہ تھا۔

صبح کچن کے باہر موہن سنگھ ہتند کار سنگھ اور دھنگا سنگھ سے کہہ رہا تھا " ارے اس کو

یہ بیٹھے بٹھائے کہاں سے آن لگی۔ دس بچے پیدا ہوں گے۔ ہاں بر ہچاری ہو یہ کالو!"

اور تینوں قہقہہ مار کر ہنس پڑے۔ اور رویر وسکے کا شیر جو علی الصبح ہی آ گیا تھا حسد اور شہوانی جذبے سے بے تاب ہو کر زور زور سے بھونکنے لگا۔

لیکن اس دن سے میں نے کالو میں ایک نئی تبدیلی دیکھی۔ اس نے اپنے آرام کی جگہ چھوڑ دی اور پنکی کے ساتھ ساتھ پھرنے لگا۔ میں بار ہا انھیں اکٹھے دیکھتا۔ پنکی ذرا آگے ہوتی اور کالو ذرا پیچھے۔ اس طرح کہ جہاں پنکی کی اگلی ٹانگیں ہوتیں، وہاں کالو کی تھوتھنی ہوتی اور اگرچہ وہ ناپ ناپ کر قدم رکھتا ہوا دکھائی دیتا تو بھی اس کی چال میں ایک طرح کی دانائی آ گئی تھی۔ شاید اب اسے کڑھوں وغیرہ کا بھی خوف نہ رہا تھا۔ پنکی کے جسم کی نزدیکی کو محسوس کرتا ہوا وہ بے خطر چلا جاتا۔

رات کو اگرچہ سردی ہوتی لیکن دن کے وقت کافی گرمی پڑنے لگی تھی۔ خلا میں لہریے سے بننے لگتے۔ آنکھیں دھوپ میں ٹکتی نہ تھیں۔ اور میں نے گھر میں کھانا منگانا شروع کر دیا تھا۔ میرا لڑکا بھی میرے پاس آ گیا تھا۔ چھوٹا بھائی تھا۔ گھر میں ٹھنڈے فرش پر چٹائی بچھا کر کسی طرح کے تکلف کے بغیر ہم کھانا کھاتے ——— تب پنکی اور کالو کچن سے نوکر کے پیچھے پیچھے آ کر سامنے برامدے میں بیٹھ جاتے۔ پنکی ہمیشہ ذرا آگے بیٹھتی اور کالو ہمیشہ ذرا پیچھے۔

کھانا کھا کر میں روٹی پھینکتا۔ پنکی آ بیٹھتی، اس کی بھوک معلوم ہوتا ہے، پھر تیز ہو رہی تھی۔ اس کا حصہ اسے دے کر میں کالو کی طرف پھینکتا وہ سونگھتا اور پیچھے ہٹ جاتا، اور پنکی کو کھا لینے دیتا۔

ان آوارہ کتوں میں یہی تجربہ سے ایسی محبت میں نے پہلی بار ہی دیکھی تھی ——— وہ پرخلوص، وفادار اور ایثار سے بھری ہوئی محبت! ویروسکے اور چیک دھری خاں کے ان دو کو میں نے ایک آدھ دن میں دو دو سانڈنوں کے پیچھے پھرتے دیکھا تھا لیکن اس کے بعد جو کچھ

ہوا اسے یاد کر کے میں کئی بار سوچا کرتا ہوں کہ کالو کتا ہی تھا یا کسی گذشتہ جنم کا کوئی ناکام پریمی!

میری عادت ہے کہ میں شام کو دفتر سے آکر سیدھا غسل خانہ میں جاتا ہوں۔ پہلے منہ ہاتھ دھوتا ہوں اور پھر کسی کام کی طرف متوجہ ہوتا ہوں۔ پر بیت نگر میں غسل خانوں کے دروازے عام طور پر کھلے رہتے ہیں۔ اور میرے یہاں تو قریب قریب سبھی کمروں کے دروازے کھلے رہتے تھے۔ اس دن میں اندر سے غسل خانہ کو جانے کی بجائے باہر سے داخل ہونے کے لئے بڑھا۔ (شاید کوئی ضروری کام تھا اور میں کپڑے تبدیل کئے بغیر منہ ہاتھ دھو لینا چاہتا تھا۔) غسل خانہ کے باہر کالو بیٹھا تھا۔ اپنی دھن میں قریب قریب اس کے اوپر سے گزرتا ہوا میں غسل خانہ میں داخل ہوا۔ دیکھا تو نالی کے پاس سیمنٹ کے کھرے پر پنکی لیٹی ہوئی ہے۔

"ہشت ہشت" میں نے اسے بھگانا چاہا۔

وہ تڑپ کر رہ گئی۔ اس نے اٹھنے کی کوشش کی، لیکن اٹھ نہ سکی۔ میں نے دیکھا اس کی ٹانگ پر ایک بہت بڑا، قریب قریب آدھی ٹانگ پر پھیلا ہوا زخم ہے۔ اس وقت مجھے یاد آیا کہ دوپہر کو کالو روٹی لینے نہ آیا تھا اور غسلخانہ کے باہر بیٹھا تھا۔

آوارہ کتوں میں بھی باہمی جنگ ہوتی رہتی ہے۔ عداوتیں اور حسد بھی ان میں کم نہیں ہوتے۔ شاید اس چتکبرے مصری خاں کے ڈوگ یا اس دیبو کے غنڈے نے اپنی گذشتہ ناکامی کا بدلہ لیا تھا۔ بالکل اسی طرح جیسے اس کے ہی گاؤں کے ڈسٹے نے اپنی محبوبہ جنتا کی ناک اور کان کاٹ لیے تھے۔

اس کے بعد میں نے پنکی کو وہیں دو تین دن پڑے تڑپتے اور روز بروز نحیف و ناتواں ہوتے اور کالو کو باہر بیٹھے دیکھا۔ پھر ایک دن جب میں دوپہر کے وقت کھانا کھانے کیلئے گھر آرہا تھا میں نے پنکی کو سخت چلچلاتی دھوپ میں پڑے لان میں تڑپ تڑپ کر جان توڑتے دیکھا۔ شاید شیطان بچوں نے اسے غسل خانہ سے باہر نکال دیا تھا۔ وہیں سے میں

واپس سردار جسونت سنگھ کے پاس گیا۔ اور میں نے ان سے درخواست کی کہ اس غریب کو تڑپنے سے نجات دلائیں۔ سردار جسونت سنگھ میرے ساتھ آئے۔ زخم کو دیکھ کر انھوں نے کہا۔ یہ نہیں بچ سکتی اس کے کیڑے پڑ گئے ہیں۔ اور انھوں نے اپنی بندوق لا کر اس کی تکلیف کو ہمیشہ کیلئے ختم کر دیا۔

اس کی نعش کو ستندر بھنگی بڑ کے عظیم درخت کے پیچھے پھینک آیا اور میں نے دو ایک بار گدھوں کو اپنی لمبی گردنیں بڑھاتے بڑے بڑے پروں کو پھٹ پھٹاتے اس طرف جاتے دیکھا۔

لیکن کالو، اس دن کے بعد پھر کہیں دکھائی نہیں دیا۔ نہ جانے وہ کہاں چلا گیا تھا ـــــ کیونکہ اردگرد کے مزدوروں سے میں پوچھتا رہتا ہوں کہ انھوں نے اپنے گاؤں میں کالو کو کبھی دیکھا ہے ـــــ کالو کو، جو کہ کالا تھا اور جس کے ہلکے شربتی ڈھیلوں میں مٹیالی نیلی پتلیاں ٹمٹمایا کرتی تھیں۔ لیکن مجھے جواب ہمیشہ "نہیں" ملتا ہے ـــــ اور کبھی جب ڈائننگ ہال کے باہر میں روٹیاں اچھالتا ہوں تو میری آنکھیں ہمیشہ دو ٹمٹماتی ہوئی پتلیوں کو دیکھنے کی ناکام کوشش کیا کرتی ہیں ـــــ اور جب اندھیری سرد راتوں میں کتے چیختے ہیں اور اونچی لمبی آوازوں میں روتے ہیں تو مجھے ہمیشہ محسوس ہوتا ہے جیسے ان میں کہیں کالو کی ناکام روح بھی نالہ و فریاد کر رہی ہے۔

بگولے

اپنی دو بیگھے کی چھوٹی سی کھیتی کو جوت، سینچ اور گوڑ کر دن رات رکھوالی کرنے کے بعد دُتّے نے گیہوں کی لہلہاتی ہوئی سنہری بالیاں پیدا کیں۔ ادھر بیساکھی کے ڈھول بجنے شروع ہوئے اور ادھر اس نے ہاتھ میں درانتی لے لی۔ اور پھر تپتی گھڑیوں میں اس نے اندھا دھند فصل کاٹی، کوٹی اور پھر سانگھے اور تنگلی کی مدد سے اس نے بھُس ملے دانوں کا ڈھیر لگایا۔

دھوپ تیز پڑنے لگی تھی۔ اور اس کی دمکتی ہوئی روشنی میں چمکتے دانے اس کے سامنے خوش حال اور فارغ البال دنوں کی تصویر کھینچ رہے تھے۔ کس طرح وہ، اس کی بیوی تیجو اور ان کے بچے کم سے کم آٹھ دس مہینوں کیلئے بھوک سے دامن چھڑا لیں گے۔ قرضہ اور لگان وغیرہ دیکر اس کے پاس اتنا تو ضرور بچ ہی جائیگا کہ وہ ان مہینوں میں اپنا اور اپنے بچوں کا

پیٹ پال سکے۔

بکھرے ہوئے بھُس کو تنگلی کی مدد سے ڈھیر پر پھینکتے ہوئے اس نے دل ہی دل میں تصورات کے کئی محل بنا لئے۔ کھانے کیلئے کافی اناج رکھ کر وہ باقی سب کا سب بیچ دے گا اور ایک بار ضرور امرتسر جائیگا۔ کتنے برس بیت گئے تھے اور وہ بَنّو کی ایک بھی تو خواہش پوری نہ کر سکا تھا۔ اسے یاد آیا اس نے ایک بار خوشبودار تیل مانگا تھا۔ لیکن خوشبودار تیل تو دور رہا وہ تو عام تیل بھی اسے بڑی مشکل سے اٹھواڑے میں ایک بار لاکر دے سکتا تھا۔ پھر ایک بار اس نے ہاتھ منہ دھونے کا انگریزی صابن مانگا تھا۔ لیکن ان کے کپڑوں کو تو دیسی صابن تک نصیب ہوئے مہینوں بیت جاتے تھے۔ اور پھر اس نے ایک بار منہ پر ملنے والی سفید سفید "ملائی" کا تقاضہ کیا تھا۔ جو ولایت سے دودھ جیسی سفید شیشیوں میں بند ہو کر آتی ہے۔ وہ لالہ اتم چند کے گھر گیہوں پھٹکنے گئی تھی اور وہاں اس نے اس کی بہو کو بھی ملائی مل کر اپنے کالے مسوں والے چہرے کو چمکاتے دیکھا تھا۔ اور شام کو جب وہ گھر گیا تھا تو وہ ملائی کا تقاضہ کرنے سے اپنے آپ کو روک نہ سکی تھی۔ وہ ہنس دیا تھا۔ پگلی، ان ملائیوں کی ضرورت تو انھیں ہوتی ہے جن کے منہ کالے اور بدصورت ہوں۔ میری بَنّو کا مکھڑا تو یونہی کوئلے کی طرح دمکتا ہے اور اسے اپنی آغوش میں لیتے ہوئے اس نے تان لگائی تھی ؎

ہائے نی تیرا رنگ نی بَنّو ۔۔۔۔۔ جنوں کتّیاں چھیاں نے

لیکن بَنّو کے چہرے پر ایک سیاہ بادل سا پھر گیا تھا۔ اور دُتّے نے دل میں فیصلہ کر لیا تھا کہ وہ اس کی سب ننھی ننھی آرزوئیں پوری کر دیگا۔

لیکن اس کے گھر پہلے ایک بچّہ ہوا۔ پھر دوسرا۔ پھر تیسرا۔ اور وہ ان میں سے ایک بھی خواہش پوری نہ کر سکا تھا۔ بَنّو کے ارمان بھی اب بدل گئے تھے۔ اپنے لئے تیل صابن یا کریم کا تقاضہ کرنے کی بجائے۔ اب وہ رحیم کے کرتے، شمیم کی قمیص، نعیم کی تہمد کیلئے شور مچایا کرتی تھی۔ اب اس کی بڑی سے بڑی آرزو یہ تھی کہ چاندی کے تعویذ بنوا کر اور پیر قلندر علی سے

دم پڑھوا کر وہ اپنے جگر کے ٹکڑوں کو پہنا دے تا کہ وہ دشمنوں کی نظر بد سے بچے رہیں۔

بھُس ملے ہوئے دانوں کے ڈھیر کو دیکھتے ہوئے اس نے سوچا کہ اس بار تو اسے ضرور ہی کچھ نہ کچھ آسانی ہو جائیگی اور وہ امرتسر جا کر نہ صرف اپنے بچوں کیلئے قمیضیں اور تعویذ بنوا لائے گا بلکہ بچو کیلئے تیل صابن اور کریم کی شیشی بھی لے آئیگا۔

اس نے اُڑاوے کو نہ بُلایا تھا۔ دو بیگھے کی کھیتی! ـــــــ کون اتنے دانے تھے، پھر دو برس کا لگان سر پہ تھا، اور لالہ الم چند کا قرضہ ـــــــ اور اس نے سوچا تھا کہ جتنے دانے وہ اُڑاوے کو دے گا ان کو بیچ کر وہ اپنے بچوں کی ضرورتیں ہی کیوں نہ پوری کر دے گا؟

دن بھٹی بنا ہوا تھا۔ آسمان سے آگ برس رہی تھی۔ دھوپ کے مارے آنکھیں نہ کھلتی تھیں اور سایوں میں بیٹھے ہوئے مویشیوں کی زبانیں نکل رہی تھیں۔ اس نے چھاج میں دانے بھر لئے۔ اور سر سے اوپر لے جا کر انھیں اڑانے لگا۔ تبھی دائیں طرف کچھ مٹی سی اڑی۔ اس میں اور مٹی ملی اور پھر بجلی کی سی تیزی سے ایک چکر گھومنے لگا۔ اور پھر وہ چکر اس تیزی کے ساتھ گھومتا، گرد اُڑاتا، آسمان کی طرف بڑھتا اس کی طرف آیا ـــــــ اس تیزی کے ساتھ کہ چھاج اس کے ہاتھ سے گر پڑا۔ اور اس نے دیکھا کہ اس کے دانوں کے ڈھیر پر بھی ایک بگولا سا اٹھا۔ دانے بکھر گئے اور اس کے ڈھیر سے بھُس کے تنکے چکر کھاتے ہوئے آسمان کی طرف اُڑ چلے۔

سامنے بگولا اُڑا جا رہا تھا۔ اس میں بھُس کے تنکے چکر کھاتے ہوئے آسمان کو چھو رہے تھے۔ دُلے کو یوں محسوس ہوا گویا وہ تنکے نہ تھے۔ تیل کی شیشیاں، بچوں کی قمیضیں اور تعویذ تھے۔

لیکن یہ تو ایک ہی تھا۔ دن میں کئی بگولے اٹھے اور بھُس کا تنکا تک بھی نہ رہا اور دانے بھی کافی اُڑ گئے۔

دوسرے دن جب اس نے سب دانے کوٹھی میں لاکر ڈال دیئے تو اس کی بیوی نے پوچھا

بس!ـــــــ اور کچھ نہیں ؟

غم انگیز مسکراہٹ کے ساتھ دتے نے کہا۔

"غریبوں کیلئے بگولے ہی آندھیاں ہیں"

وہ میری منگیتر تھی

پہاڑی ریاست کی حوالات۔ بلیک ہول سے بھی زیادہ ہولناک۔ گہری کھڈ میں ایک چھوٹا سا چھپر، اس میں ایک تہ خانہ ——— تاریک، بدبودار اور سیل بھرا، سردی اتنی کہ جسم شل ہو کر رہ جاتے۔ فرش دلدل، دیواریں خستہ اور بوسیدہ۔ تہ خانہ کے اوپر سپاہیوں کے رہنے کیلئے لکڑی کے تختوں کی چھت۔ نیچے تہ خانہ کو جانے کیلئے کھٹکے سے لگا ہوا ڈیڑھ دو مربع گز چوڑا تختہ!

حوالات کے دروازہ میں ایک چوکیدار بیٹھا تھا۔ اور باہر ایک بھنگی کہیں سے کام کرتا کرتا تھک کر آگ تاپنے آ بیٹھا تھا۔ دونوں میں باتیں ہو رہی تھیں۔ موضوع تھا اس قیدی کی غلطی جو سی پی کا میلا دیکھنے آیا تھا۔ اور ایک باوردی سپاہی سے جھگڑا کرنے اور لڑنے کے الزام میں حوالات میں ٹھونس دیا گیا تھا۔ چوکیدار کو اس سے ہمدردی تھی۔ شاید

اسے کوئی اپنا پرانا واقعہ یاد آ گیا جس کا نام تھا گوبند۔ اس سے بولا:۔

"بھئی! اس میں نہ سپاہی کا قصور ہے نہ اس کا۔ سب قصور ہے بُرے دنوں کا۔ اس کا ستارہ چکر میں ہے۔ بدبختی کے آگے کسی کی پیش نہیں جاتی۔ سچ جانو ہم پر بھی ایک دفعہ مصیبت آئی تھی۔ اور ہمیں جو جو تکلیفیں برداشت کرنی پڑیں ان کی یاد سے آج بھی رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔"

"آپ کو؟" گوبند نے پاؤں بھی آگ کے سامنے پسارتے ہوئے کہا اور چوکیدار کی داستان سننے کیلئے تیار ہو گیا۔

چوکیدار نے ذرا سے وقفہ کے بعد کہنا شروع کیا:۔

"ہاں گوبند میرے ساتھ بھی ایسا ہی سانحہ پیش آیا تھا۔ اور وہ بھی اسی میلے میں۔ اس وقت لالہ صاحب بہت چھوٹے تھے۔ میلہ تب بھی بڑی شان و شوکت سے لگتا تھا۔ اور تب یہاں آنیوالی عورتوں کی تعداد بھی کہیں زیادہ تھی۔ ناچ رنگ بھی بہت ہوتا تھا اور کھیل تماشوں کی بھی کمی نہ تھی۔

میں نے میلہ پہلے کبھی نہ دیکھا تھا۔ تھا تو ادھر ہی کا رہنے والا لیکن بچپن ہی سے اپنے دادا کے پاس لاہور چلا گیا تھا۔ وہاں پندرہ سال نوکر رہا۔ پھر میرے مالک نے مجھے جواب دیدیا۔ بات کچھ بھی نہ تھی۔ مجھ سے کوئی خطا نہ ہوئی تھی۔ لیکن میرا عمر میں بڑا ہو جانا ہی میرے حق میں بُرا ثابت ہوا۔ وہاں بھلے آدمی زیادہ عمر والے نوکروں کو گھروں میں نہیں رکھتے۔ میں نے اور دو ایک جگہ نوکری کرنے کی کوشش کی لیکن اور کسی جگہ میرا من نہ لگا۔ میں اپنے گاؤں واپس آ گیا۔ شہر چھوڑنے کو جی نہ چاہتا تھا۔ دل اُداس تھا۔ لیکن گاؤں میں پہنچتے ہی میری سب اداسی، سب بے چینی دور ہو گئی۔ یہاں گھنے درختوں کے نیچے ٹھنڈی مست ہواؤں میں بنسری کے راگ الاپنے میں جو لطف آتا تھا وہ لاہور کی گرمی میں کہاں؟ بنسری مجھے دادا نے سکھائی تھی۔ لاہور میں بجانے کا موقع ہی نہ ملتا تھا اور

گاؤں میں گانے بجانے کے سوا کچھ کام ہی نہیں تھا۔ میں بانسری کو ہونٹوں سے لگاتا تو میٹھی میٹھی تان دور دور گھاٹیوں تک گونج جاتی۔

گاؤں میں آنے پر مجھے ایک بات کا اور بھی احساس ہوا۔ اور وہ یہ کہ میں اب نوکر نہیں کسی کا ملازم نہیں، کسی کی خواہشات کا غلام نہیں۔ بلکہ ایک آزاد شخص ہوں۔ ہماری تھوڑی سی زمین تھی اسے بوتا جو تنا میں نے جلدی ہی سیکھ لیا تھا۔ لاہور میں مجھے غلام سمجھا جاتا تھا۔ کوئی پوچھتا بھی نہ تھا۔ یہاں اندھوں میں کانا راجہ تھا۔ جدھر سے گزر جاتا سب کی نظریں اٹھ جاتیں۔ سب مجھے عزت کی نگاہ سے دیکھتے۔ سب مجھے اپنے سے بڑا سمجھتے۔ شہر سے آنے کی وجہ سے میری پوشاک بھی نسبتاً ستھری ہوتی۔ جب میں گاؤں میں آیا تو میرا چرچا گھر گھر ہوا۔ کئی جوبن ماتی لڑکیوں کی نگاہیں مجھ سے چار ہوئیں۔ محبت کے پیغام بھی ملے لیکن میرا من کسی سے نہ لگا۔ میں اپنی کھیتی باڑی میں محو، اپنی بانسری کی تانوں میں مست رہنے لگا۔

سردی بیتی اور روح کو گرما دینے والا موسم آگیا۔ مئی اور ستمبر کے دو ہی مہینے ہیں جن میں ادھر پہاڑوں کا لطف اٹھایا جا سکتا ہے۔ سورج میں ذرا گرمی آجاتی ہے اور اس کی سنہری دھوپ سے خزاں کی سکڑی ہوئی پتیاں کھل آتی ہیں۔ ان دنوں میں کچھ نہ کیا کرتا۔ کھیتی باڑی کا کام اپنے بڑے بھائی پر چھوڑ کر خود ڈھور ڈنگر لیکر نکل جاتا۔ سارا دن گائیں چراتا۔ شام کو دودھ دوہتا اور سنجولی جا کر بیچ آتا۔ صبح شام دودھ دوہنے اور بیچنے کے سوا مجھے کوئی کام نہ تھا۔ سارا سارا دن آزادی سے گائیں چراتا۔ تھک جاتا تو کسی درخت کے گھنے سایہ میں بیٹھ کر بانسری بجاتا۔

انہی دنوں مورتو سے میری ملاقات ہوئی۔ شام کا وقت تھا مجھے کچھ دیر ہوگئی تھی۔ اس لئے لمبے لمبے ڈگ بھرتا ہوا سنجولی کی طرف جا رہا تھا۔ کسی نے پکارا "بھیا ذرا ٹھیرنا"

میں نے پیچھے مڑ کر دیکھا۔ ساتھ کے گاؤں سے آنیوالی پگڈنڈی پہ ایک نوجوان خوبصورت لڑکی کندھے پر دودھ کے ڈبے لٹکائے۔ گلے میں گیروا گیروں کی قمیص اس پر جاکٹ۔

کمر میں کالی شنقی۔ پاؤں میں خاکی رنگ کا فلیٹ شو اور سر پر گلابی دوپٹہ اوڑھے شپا شپ بڑھی چلی آرہی ہے۔ اس کی ناک میں بڑی سی لونگ تھی۔ اس شام کے دھندلکے میں مجھے اسکی صورت بھلی لگی۔ بھولی بھالی، سیدھی سادی ـــــ میں رُک گیا اور جب تک وہ میرے برابر نہ آگئی میں اسے ایک ٹک دیکھتا رہا۔

نزدیک آنے پر معلوم ہوا کہ اسے بھی دودھ دینے سنجولی جانا ہے۔ اور اندھیرا ہو جانے سے وہ کچھ خوف زدہ ہے۔ میں نے اسے تسلی دی اور ہم دونوں جلدی جلدی سنجولی کی طرف چل پڑے۔ کچھ دیر خاموشی سے چلتے رہے۔ لیکن شام کا سہانا وقت۔ ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا۔ کیلوؤں کے سر بفلک درخت۔ راستے کی خاموشی۔ کوئی تنہا ہو تو قدم بڑھائے چلا جائے۔ ساتھی کے ہوتے ہوئے گم سُم چلنا مشکل ہے۔ ہم دونوں بھی آہستہ آہستہ باتیں کرنے لگے۔ پہل کس نے کی، یہ یاد نہیں۔ لیکن سنجولی پہنچتے پہنچتے ہم دونوں گھل مل گئے۔ آتے وقت بھی ہم اکٹھے ہی آئے۔ اس نے کہا تھا میں دودھ دیکر یہاں پمپ پر تمہارا انتظار کرونگی۔ اور جب میں واپس آیا تو وہ اس جگہ میرا انتظار کر رہی تھی۔ اندھیرا بڑھ چلا تھا لیکن باتوں میں راستے کی مسافت کچھ بھی محسوس نہ ہوئی۔ جو راستہ پہلے کاٹے نہ کٹتا تھا اب منٹوں میں ختم ہوگیا۔ اور ہم وہاں پہنچ گئے جہاں سے ہمیں جُدا ہونا تھا۔

جُدائی کے خیال ہی سے میرا دل دھڑکنے لگا۔ انتہائی دلیری سے کام لیتے ہوئے میں نے کہا۔

"تاریکی زیادہ بڑھ گئی ہے۔ میں تمھیں تمھارے گھر تک چھوڑ آتا ہوں پھر اپنے گاؤں چلا جاؤں گا۔"

وہ مان گئی۔ میں اسے اس کے گھر تک چھوڑنے گیا۔ اس کے گھر کے نزدیک ہم رُکے۔ اس کی آنکھوں میں تشکریہ کی جھلک تھی۔ جاتے جاتے اس نے پوچھا "تم روز ادھر جاتے ہو؟"

"ہاں ـــــ اور تم؟"

"میں بھی ــــــــ"

بس اس کے بعد ہم جُدا ہو گئے۔ میں تیزی سے واپس پھرا لیکن جلد ہی میری چال دھیمی ہو گئی۔ اور میں اپنے خیالات میں محو چلنے لگا۔ جب چونکا تو دیکھا سنجولی کے قریب پہونچ گیا ہوں۔ پھر واپس مُڑا۔ گھر پہنچا تو دیر ہو گئی تھی۔ میرے بھائی کو فکر ہو رہا تھا۔ میں نے کہدیا۔

"میرا لاہور کا ایک دوست مل گیا۔ اس کے ساتھ چلا گیا تھا"

اس رات گو یند ا مجھے نیند نہ آئی۔ ساری رات اس کی آنکھیں۔ اس کی نازک کامنی سی صورت، اس کا خوبصورت چہرہ، اس کی مستانی چال آنکھوں میں رقص کرتی رہی۔ اس کی میٹھی باتیں۔ اس کا یہ پوچھنا "تم روز ادھر جاتے ہو کیا" اس کے کانپتے لبوں سے نکلا ہوا ہر لفظ میرے کانوں میں گونجتا رہا۔ ایک دو بار میں نے اپنی متعارف لڑکیوں سے اس کا موازنہ کیا۔ کوئی غیر معمولی خوبی نہ تھی اس میں۔ شاید اس سے بھی زیادہ خوبصورت لڑکیاں ہمارے اپنے گاؤں میں تھیں لیکن نہ جانے اس میں کیا تھا۔ اس کی آنکھوں میں کیا جادو تھا۔ میں دیوانہ سا ہو گیا۔ وہ دن میری تمام زندگی کا حاصل ہے۔ جس کی یاد آج بھی خاموشی اور تنہائی میں میرا ساتھ دیتی ہے۔

دوسرے دن ہم پھر ملے۔ اسی جگہ جہاں کل ملے تھے۔ میں نے اس سے ملنے کیلئے کوئی خاص تردد نہیں کیا۔ اپنے مقررہ وقت پر چل پڑا۔ لیکن پھر بھی ہم ایک ہی وقت میں اس مقام پر اکٹھے ہو گئے۔ پھر میں اسے سنجولی اور سنجولی سے گھر تک چھوڑنے گیا۔ اور پھر اسی طرح خوشی خوشی واپس آیا۔ ہاں آج ایک اور بات کا پتہ لے لیا۔ وہ بھی دن کو اپنی گائیں چرایا کرتی تھی۔ لیکن دوسری گھاٹی میں۔ دوسرے دن میری گائیں بھی اسی گھاٹی کی طرف جا نکلیں۔ جیسے اچانک۔ پہلے وہ کچھ جھجک گئی۔ جب میں نے اپنی گائیوں کو واپس موڑنا چاہا تو اس نے بتایا کہ گھاٹی میں گھاس بے حد اچھی ہے۔ اور وہ اپنی گائیں وہیں چرانے لاتی ہے۔

بیں نہ جاسکا۔ ڈنگروں کیلئے اس سے اچھی گھاس کہاں ملتی۔ اور پھر اس کی وہ سنہری مسکراہٹ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

ہم روز اکٹھے گائیں چراتے۔ اکٹھے دودھ لیکر بجولی جاتے۔ اکٹھے واپس آتے۔ میرا بانسری کا شوق بھی ان دنوں بڑھ گیا تھا۔ رات کو میں عموماً اپنے گھر کے باہر کسی اونچی جگہ بیٹھ کر بنسری بجایا کرتا۔

ایک ہی فقرے میں کہہ دوں گوبند! ہم دونوں میں محبت ہو گئی تھی۔ جس دن میں اپنی گائیں لیکر پہلے پہنچ جاتا اور وہ دیر سے آتی تو اس دن میرے دل میں ہزاروں وسوسے پیدا ہو جاتے۔ اس کا بھی یہی حال تھا۔ آہستہ آہستہ ہماری محبت کی داستان ہمارے گاؤں میں پہنچ گئی۔ میرے بھائی اور اس کے والدین کو پتہ چل گیا۔ انھوں نے ہماری سگائی کر دی۔

ہماری خوشی کا ٹھکانہ نہ رہا۔ لیکن اس خوشی میں ایک غم بھی تھا۔ یہ جان کر کہ اب اُسے میری بیوی بننا ہے اس نے باہر آنا جانا چھوڑ دیا تھا۔ میں اپنی گائیں لے کر اس گھاٹی میں جاتا جہاں ہم اکٹھے گائیں چرایا کرتے تھے۔ اس چٹان پر بیٹھا پہروں بنسی بجایا کرتا، جہاں ہم اکٹھے بیٹھتے تھے۔ لیکن سب بے سود، اس کی صورت تک نظر نہ آئی۔ دودھ دینے بھی اب اس کا چھوٹا بھائی جاتا تھا۔ میں اس سے مورتو کی باتیں پوچھا کرتا۔ کبھی وہ سلونہ لوح لڑکا مجھے ٹھیک ٹھیک جواب دے دیتا۔ اور کبھی میری باتیں اس کی سمجھ میں نہ آتیں۔

اسی انتظار میں کچھ ہفتے بیت گئے۔ لیکن میرے دل کی بے چینی کم نہ ہوئی۔ میں مورتو کی صورت کو ترس گیا۔ اسے دیکھنے کیلئے میری سب کوششیں ناکام ثابت ہوئیں۔

تم پوچھو گے گوبند! ــــــــــ چوکیدار نے لمبا سانس لیکر کہا۔ جب میں نے اسے ابھی صرف دیکھ رکھا تھا۔ محبت کی کئی صبحیں اور شامیں اس کے ساتھ بسر کی تھیں اور جب

اسے میرے ہی گھر آنا تھا تو پھر اسے دیکھنے کی بے چینی کیوں؟ ـــــــ میں خود صحیح طور پر اس سوال کا جواب نہیں دے سکتا۔ درحقیقت جس روز ہماری سگائی ہوئی اس کے بعد وہ مجھے ایک دفعہ بھی نہیں ملی۔ اور میں سگائی کے بعد اس کے ساتھ کئی طرح کی باتیں کرنا چاہتا تھا۔ اس کے بعد وہ کس طرح کی باتیں کرتی ہے۔ کس طرح اس کا چہرہ شرم سے سُرخ ہو جاتا ہے کس طرح اس کی زبان لڑکھڑانے لگتی ہے؟ میں ان سب باتوں کا لطف لینا چاہتا تھا۔ لیکن اس نے جیسے گھر سے باہر نکلنے کی قسم کھالی ہو۔ میں لاکھ اِدھر اُدھر چکر لگاتا لاکھ بلسری کے ذریعے پرانے جانے پہچانے سندیسے بھیجتا لیکن وہ نہ آتی۔

انہی دنوں سی۔ پی کا میلہ آگیا۔ میری خوشی کی انتہا نہ رہی۔ میلہ دیکھنے وہ ضرور جائے گی۔ اس بات کا مجھے پورا یقین تھا۔ اور پھر کہیں ہیں اسے دیکھ پاتا اور موقع پا کر اس سے دو باتیں کر لیتا۔ امکان سے باہر نہ تھا۔ میں کئی دن پیشتر ہی میلے کی تیاریوں میں مصروف ہو گیا۔ دودھ بیچنے پر جو کچھ بچتا اس میں سے بھیّا مجھے بھی کچھ دیدیتے تھے۔ آہستہ آہستہ یہ رقم جمع ہوتی گئی۔ اب میرے پاس پچاس روپے ہو گئے تھے۔ میں نے ان سے ایک خاکی کوٹ اور ایک برجس سلوائی۔ ایک اچھا سا بوٹوں کا جوڑا خریدا، دھاری دار گبرون کی دو قمیصیں بنوائیں۔ ایک پتلا سا ململ کا بجلی رنگ کا صافہ رنگوایا۔ اور میلہ کے دن ان سب کپڑوں سے سج کر میں نے نوک دار کلاہ پر صافہ باندھا اور اس کے شملہ کا پھول بنا کر شیشہ میں اپنی صورت دیکھی تو غرور سے میرا سینہ پھول اٹھا۔

ریشمی رومال کوٹ کی اوپر کی جیب میں رکھ کر، قمیص کے کالروں کو کوٹ کے اوپر چڑھا کر ہاتھ میں چھوٹی سی چھڑی لیے جب میں میلہ کو روانہ ہوا تو گاؤں کے سب لوگ میری طرف ایک ٹک دیکھتے رہ گئے۔ مجھے دیکھ کر کون کہہ سکتا تھا کہ یہ روز صبح شام دودھ لے کر سجولی جانے والا گوالا ہے۔ اور اس کا کام گائیں چرانا اور ان کی دیکھ بھال کرتا ہے۔

راستہ میں پانی کی ایک سبیل تھی یونہی کچی مٹی اور پتھروں سے تین دیواریں کھڑی کر کے

ان پر ٹین کا چھپر ڈال دیا گیا تھا۔ چھپر پر بڑے بڑے پتھر رکھ دیئے گئے تھے تاکہ تیز ہوا سے کہیں اُڑ نہ جائے۔ اس طرح بنی ہوئی اس کوٹھڑی کی ایک طرف بالکل کھلی ہوئی تھی۔ کوئی دروازہ وغیرہ بھی نہیں تھا۔ یہاں پر ایک بڑا سا پتھر رکھا تھا جس پر ادھیڑ عمر کی عورت بیٹھی پانی پلا رہی تھی یہی مورتو کے گاؤں کی بڑھیا بچھی تھی جیتی چالاکی میں ارد گرد اس کا کوئی ثانی نہ تھا۔ میں اس سبیل پر آکر رکا۔ بظاہر کچھ ستانے کیلئے۔ لیکن میری دلی خواہش یہاں رہ کر مورتو کے آنے کا انتظار کرنا تھی۔

یہ سبیل دائیں طرف کیلو دکے جھنڈ میں بنی ہوئی تھیں۔ راستہ کے ایک طرف کچھ سیجائی تھی۔ پہاڑ پر نیچے کی طرف سیڑھیاں سی بنی ہوئی تھیں۔ اور گاہوں کے ادھر ادھر چلنے سے یہ چھوٹی سی پگڈنڈیاں پنجاب کے نقشے میں دریاؤں کی طرح معلوم ہوتی تھیں۔ میں سبیل کے نزدیک راستہ کی طرف پیٹھ کر کے نیچے کو ٹانگیں لٹکا کر بیٹھ گیا۔ صافہ اتار کر پاس ہی پڑے ہوئے پتھروں پر رکھ دیا۔ لیکن مجھ سے بہت دیر تک اس طرح نہ بیٹھا گیا۔ میں بچھی سے کچھ باتیں کرنی چاہتا تھا۔ اٹھا۔ پانی پینے کے بہانے وہاں پہنچ گیا۔ پانی پینے ہی لگا تھا کہ بچھی نے کہا۔

"پانی سے پیاس کیا بجھے گی چاہے منوں پی جاؤ۔ جسے دیکھنے کی پیاس ہے وہ ابھی ادھر سے نہیں گذری۔"

میں نے رازدارانہ انداز میں آہستہ سے پوچھا "آج میلہ دیکھنے کو جائیگی؟"

"شاید ــــ"

"سہیلیاں ساتھ ہوں گی؟"

"ہاں ــــ"

"پھر میں کیسے اس سے بات کر سکوں گا؟"

"صرف دیکھنے سے پیاس نہیں بجھتی؟" وہ ہنسی۔

"نہیں!"

چمپی چپ ہو رہی۔

میں نے کہا "تم نہ کچھ انتظام کر دو گی؟"

چمپی کا ہنستا ہوا پوپلا منہ میری طرف اٹھا اور اس کی آنکھیں چمکنے لگیں۔

"کیسے؟" اس نے پوچھا۔

"میں وہاں درختوں کے جھنڈ میں ہوں" میں نے جواب دیا "تم کہہ دینا کہ تمھاری ایک سہیلی وہاں تمھارا انتظار کر رہی ہے۔ اس سے مل آؤ"

"نہ۔ میں یہ نہیں کر سکتی"

میں نے کچھ اور کہنے کی بجائے جیب سے ایک روپیہ نکال کر اس کے سامنے رکھ دیا۔ اس نے شاید ساری عمر روپیہ نہ دیکھا تھا۔ باچھیں کھل گئیں۔ کہنے لگی "یہ تکلیف کیوں کرتے ہو۔ بھیج دوں گی اسے آخر وہ تمھارے گھر ہی تو آئے گی"

میرا دل مسرت سے کھل اٹھا اتنی جلدی یہ کام ہو جائیگا اس کی مجھے امید نہ تھی۔ بائی پی کر اپنی جگہ آ بیٹھا اور اس کے آنے کی گھڑیاں گننے لگا۔ پاؤں کی ذرا سی چاپ بھی مجھے مورتو کے آنے کا یقین دلا دیتی۔ اور میری آنکھیں سبیل کی طرف اٹھ جاتیں لیکن ہر بار مایوس ہو کر واپس پھرتیں۔ انتظار کے یہ لمحے صدیوں معلوم ہوتے۔ بار بار دیکھنا، بار بار تاکنا۔ کبھی ہریالی میں سے دوپٹے کی ذرا سی جھلک دکھائی دیتی تو دل دھڑکنے لگ جاتا۔ یہ بھی اچھا تھا کہ جس جگہ میں بیٹھا تھا وہاں سے میں سب کو دیکھتا تھا لیکن مجھے کوئی نہ دیکھ سکتا تھا۔..

آخر مجھے اس کی آواز سنائی دی۔ چمپی اسے میری طرف آنے کیلئے کہہ رہی تھی۔ اور وہ سادگی سے پوچھ رہی تھی۔ میرا دل دھڑکنے لگا کہیں وہ سب سہیلیوں کے ساتھ ہی ادھر نہ آ جائے۔ لیکن نہیں وہ تنہا ہی آ رہی تھی۔ ہوا سے اس کے سر کا دوپٹہ اڑ رہا تھا۔ اس کا چھپا نا ہوا کرتہ اڑ رہا تھا۔ وہ خود بھی اڑی ہی رہی تھی۔ میرے نزدیک آ کر وہ بھونچکی سی کھڑی

ہوگئی۔ اور ایک لمحہ بعد سنہری مسکراہٹ اس کے ہونٹوں پر چمک اٹھی۔

وہ واپس بھاگنے لگی تھی کہ میں نے اسے پکڑ لیا۔ اور فوری جذبے کے ماتحت اپنی پیاسی آغوش میں لے کر اس کے ہونٹوں کو چوم لیا۔

اس کا چہرہ سرخ ہوگیا اور وہ میری آغوش سے اپنے آپ کو رہا کرنے کی کوشش کرنے لگی۔ میں نے اپنا ریشمی رومال اس کی جیب میں ٹھونس دیا۔

وہ بھاگ گئی۔ میں کچھ نہ کر سکا کتنی باتیں سوچی تھیں کتنے منصوبے باندھے تھے لیکن زبان نہ ہلا سکا۔ نہ جانے میرے حلق میں کیا گولا سا آکر پھنس گیا۔

وہ اپنی سہیلیوں کے ساتھ جا ملی۔ اپنے چہرے کی لالی اپنے بکھرے ہوئے بالوں۔ اپنی گھبرائی ہوئی صورت کا سبب اس نے انھیں کیا بتایا۔ یہ مجھے معلوم نہیں۔ لیکن ان کے چلے جانے کے بعد میں نے اپنا صافہ سر پر رکھا۔ اور درختوں کے جھنڈ سے باہر نکل آیا۔ میرے ہونٹ ابھی جل رہے تھے۔ اور میرا دل ابھی تک دھڑک رہا تھا۔

"ہمارا گاؤں"۔۔۔۔۔۔ چوکیدار نے کچھ وقفے کے بعد پھر کہنا شروع کیا "سنجولی اور مشوبرہ کے راستے میں ہے۔ سبیل سڑک سے نیچے ہی گاؤں سے کوئی ایک میل اوپر کی طرف واقع تھی۔ میں جھمی سے بنا ملے ہی اوپر کو چل پڑا۔ سڑک پر پہنچکر میں نے مشوبرہ کی طرف دیکھا۔ مورتو اپنی سہیلیوں کے ساتھ دور نکل گئی تھی۔ میں سر جھکائے چل پڑا۔ طبیعت پر کچھ اداسی چھا گئی تھی۔ اس وقت میں اس کی وجہ نہ سمجھ سکا۔ مورتو سے ملنے کے بعد میرے دل میں خوشی کا جو سمندر موجزن ہو اٹھا تھا۔ وہ بالکل اُتر سا گیا۔ ہونا بالکل برعکس چاہئے تھا لیکن ہوا ایسا ہی۔ مسرت سے تیز تیز چلنے کی بجائے میں آہستہ آہستہ چلنے لگا۔ خیال آیا شاید مورتو ناراض ہوگئی ہو۔ شاید میری اس دیدہ دلیری سے غصہ ہوگئی ہو۔ اب میلہ میں اس سے آنکھیں کیسے ملا سکوں گا۔ دل میں چور سا بس گیا تھا اور خواہش ہوتی تھی کہ میلہ دیکھنے نہ جاؤں۔ واپس گاؤں کو مُڑ جاؤں۔ لیکن اسے ایک بار

دیکھنے کی مسرت کو میں روک نہ سکا اور میلہ میں جا پہنچا۔

وہاں پہنچتے ہی میرے سب اندیشے دور ہو گئے۔ مورتو مجھے میلہ سے ذرا ادھر ہی ملی۔ وہ سب سستا رہی تھیں بظاہر ایسا ہی معلوم ہوتا تھا۔ لیکن مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے وہ سب میرا انتظار کر رہی ہیں۔ مجھے دیکھتے ہی مورتو مسکرا دی۔ اس کی آنکھیں ناچ اٹھیں۔ میرا دل مسرت سے کھل اٹھا۔ اسی وقت میرے گاؤں کا ایک ساتھی میرے پاس سے گذرا میں نے اسے زور سے آواز دی۔

"ستاؤ یار۔ میلے میں جا رہے ہو؟"

"ہاں" اس نے رک کر کہا۔

"کدھر ملو گے؟"

"یونہی ادھر ادھر گھومیں گے"

"ہم تو وہیں درختوں کے جھنڈ کے پیچھے ڈیرہ لگائیں گے۔ ادھر آنا ضرور یا" میں نے مورتو کی طرف دیکھ کر کہا۔ باتیں میں ساتھی سے کر رہا تھا لیکن اشارہ مورتو کی طرف تھا۔ ساتھی چلا گیا۔ وہ مسکرا دی۔ اس وقت سب چلنے کیلئے اٹھیں۔ میں بھی جلدی جلدی قدم بڑھاتا ہوا اسی پور جا پہنچا۔

میلہ خوب بھر رہا تھا۔ میں تھک گیا تھا۔ آسمان پر کچھ بادل چھا گئے تھے اور ٹھنڈی میٹھی ہوا چل رہی تھی۔ میں اس جگہ کے پیچھے جہاں آج میلہ میں چائے کا خیمہ لگا ہوا تھا جا کر بیٹھ گیا۔ کتنی دیر وہاں بیٹھا تصورات کے قلعے تعمیر کرتا رہا۔ جب اشروں کے آتے ہیں باجوں کی آواز ایک دم فضا میں گونج اٹھی تب میرے خیالات کا سلسلہ ٹوٹا۔ اپنے جانتے میں مورتو کا انتظار کر رہا تھا۔ یہ نہ سوچا کہ جب سے اس جگہ کا پتہ ہی نہیں تو وہ یہاں آئے گی کیسے۔ بس یہ خیال آتے ہی اٹھا۔ اور ادھر ادھر گھوم کر وہاں پہنچا جہاں عورتیں بیٹھی ہوئی تھیں۔ مورتو بھی ایک طرف بیٹھی تھی۔ میں اس کے سامنے سے گذرا

لیکن اس کی آنکھیں کسی اور طرف تھیں۔ میں ایک طرف ہٹ کر کھڑا ہو گیا اور اس بات کا انتظار کرنے لگا کہ وہ میری طرف دیکھے۔ ایک دو دفعہ میں نے یونہی کسی کو پکارا تاکہ وہ میری طرف متوجہ ہو لیکن شاید اسے میری آواز سنائی نہیں دی۔ اس وقت میں نے دیکھا کہ ایک دوسرا شخص بھی مورتو کی طرف رہ رہ کر بھوکی نظروں سے دیکھ رہا ہے۔ یہ تھا ریاست کا داروغہ۔ حسد اور غصے سے میری آنکھیں سرخ ہو گئیں لیکن اپنے آپ کو سنبھال کر میں وہاں کھڑا رہا۔ اس دوران میں داروغہ کی گستاخ نگاہیں متواتر مورتو کے خوبصورت چہرے پر جمی رہیں۔ آخر مورتو کی نگاہیں مجھ سے چار ہوئیں۔ میں نے اسے ہاتھ سے آنے کا اشارہ کیا۔ اس نے شرماتے ہوئے منظوری دیدی۔ شاید داروغہ نے بھی ہماری اشارہ بازی کو دیکھ لیا۔ دوسرے لمحے میں میں نے اس کی طرف دیکھا اور اس نے میری طرف۔ اس کی آنکھوں میں بھی حسد تھا ـــــ شاید غصہ بھی .... میں نے اس کی کچھ پروا نہ کی۔ اور ایک بار پھر مورتو کی طرف دیکھ کر اس کے سامنے ہی درختوں کی اوٹ میں ہو گیا۔ کچھ دیر بعد وہ بھی آگئی۔ محبت اور مسرت کی زندہ تصویر۔ میں نے کہا:

"مورتو! تم تو دکھائی ہی نہیں دیتیں۔ عید کا چاند ہو گئیں؟"

"اور تمہارا کون پتہ چلتا ہے" اس نے گلہ آمیز لہجہ میں کہا "میں اس جھنڈ کے پیچھے دیکھ دیکھ کر ہار گئی۔"

"لیکن میں تو ادھر تھا۔"

"میں کیسے جان سکتی ہوں۔" اس نے گلہ آمیز لہجے میں کہا۔

میں نے اس کا ہاتھ پکڑا "چلو ادھر اس جھنڈ کو۔" اور ہم گھنے درختوں کی اوٹ میں چلے گئے۔ اور ایک اچھی سی جگہ بیٹھ گئے۔ میلے میں آئے لوگوں کا شور و غل [illegible] کی طرح معلوم ہوتا تھا۔ معلوم ہوتا تھا جیسے ہم دنیا اور اس کے ہنگاموں سے [illegible] دور آ گئے ہیں۔ اپنی باتوں میں ہم محو ہو گئے اور اس میں [illegible] نہ جانے ہم نے

مستقبل کے کتنے قلعے بنائے اور بگاڑے! ان درختوں کے اس ٹھنڈے میٹھے سائے میں۔ اس سرمستی ہوائیں۔ اس حوصلہ افزا تنہائی میں، مورتو مجھے سراپا حسن معلوم ہوئی۔ اور میں نے ایک غیر معمولی جذبے سے متاثر ہو کر اسے اپنی طرف کھینچا۔ اس وقت ہمارے سامنے زمین پر کسی کا گہرا سایہ پڑا۔ میں نے چونک کر پیچھے کی طرف دیکھا۔ وہی داروغہ غضب ناک نگاہوں سے مجھے گھور رہا تھا۔ میں تنتنا کر کھڑا ہو گیا۔ مورتو بھی بیٹھی نہ رہ سکی۔

"اس عورت کو کہاں بھگا لیجانے کی کوشش کر رہے ہو؟" اس نے مورتو کو بازو سے پکڑ کر اپنی طرف کھینچتے ہوئے کہا۔

میری آنکھوں میں خون اتر آیا۔ میں نے کڑک کر کہا۔ "اسے ہاتھ مت لگاؤ۔"

"کیوں تمھاری کیا لگتی ہے؟"

"میری منگیتر ہے۔"

"چل منگیتر کے سالے، راناصاحب کے پاس چل، سب معلوم ہو جائیگا۔ یہ تمھاری منگیتر ہے یا آشنا! یہاں میلہ دیکھنے آتے ہو یا بدمعاشی کرنے؟" یہ کہتے کہتے اس نے ہوس انگیز نگاہیں مورتو پر ڈالیں۔

وہ کھڑی تھر تھر کانپ رہی تھی غصے سے میری آنکھوں میں خون اتر آیا۔ میرا سارا جسم بھی کانپنے لگا۔ میں نے ایک ہاتھ سے مورتو کو اس کے پنجے سے چھڑایا اور دوسرے سے ایک زور کا تھپڑ اس کے منہ پر رسید کیا۔ اس نے مجھے گالی دی اور ہنٹر کا وار کیا۔ اور سیٹی بجائی۔ مجھے غصہ تو آیا ہوا ہی تھا۔ میں نے ہنٹر اس کے ہاتھ سے چھین کر کھڈ میں پھینک دیا اور اسے پکڑ کر زمین پر پٹک دیا ——— ایک چیخ ——— اور بیسیوں لوگ اس طرف دوڑے آئے۔ آگے آگے کئی سپاہی تھے۔ آتے ہی انھوں نے مجھ پر ہنٹروں کی بارش کر دی۔ میرا نوجوان دل بھر اٹھا۔ یوں چپکے سے شکست مان لینا اسے منظور نہ تھا۔ میں نے حملہ آوروں میں سے ایک کو پکڑ لیا اور چوٹوں کی پروا نہ کرتے ہوئے اپنے بازوؤں پر اٹھا کر اسے کھائیں دھکیل دیا۔ پھر ایک

دوسرے کی باری آئی۔ وہ بھی لڑھکتا ہوا کھڈ میں چلا گیا۔ پھر سیٹیاں گونجیں اور لوگ آگئے، مجھ پر چاروں طرف سے حملے ہونے لگے۔ میرے تمام جسم سے خون بہہ نکلا۔ پھر بھی میں اس وقت تک لڑتا گیا جب تک میں بیہوش نہ ہو گیا۔

جب میں ہوش میں آیا تو بیتا" چوکیدار نے لمبا سانس لیکر پھر کہنا شروع کیا"! تو میں نے اپنے آپ کو اسی حوالات میں ___ اسی پنچے کے تہ خانہ میں پڑے پایا۔ اس تاریکی اور تنہائی میں میرا دم گھٹنے لگا۔ مورتو کے ساتھ کیا بیتی ؟ اس خیال سے جی بے چین ہو اٹھا۔ ماضی میں کیا ہوا اور مستقبل میں کیا ہوگا۔ ان خیالات نے دماغ کو گھیر لیا۔ آنکھوں کے سامنے طرح طرح کی تصویریں آنے لگیں۔ سب ڈراونی۔ سب بھیانک۔ اس وقت میرا عضو عضو درد کر رہا تھا۔ لیکن مجھے ان سب تکالیف کی کوئی پرواہ نہ تھی۔ دکھ تھا تو مورتو کی جدائی کا۔

دوسرے دن سپاہی مجھے راناصاحب کے سامنے پیش کرنے کیلئے لینے آئے لیکن مجھ سے تو ہلا تک نہ جاتا تھا۔ تین دن تک یہیں پڑا اپسوؤں کے ڈنک سہتا رہا۔ تیسرے دن کیا رکوٹی لے جایا گیا۔ وہاں آرام ہو جانے پر میرا مقدمہ پیش ہوا۔ مجھ پر میلے سے ایک عورت کے اغوا کرنے اور باوردی سپاہیوں کو ان کے فرائض کی انجام دہی سے روکنے اور زدو کوب کرنے کا الزام لگایا گیا۔ مدعی ہی منصف تھا۔ مجھے ڈھائی سال کی سزا دی گئی۔ میرے بھائی کی سب کوششیں، منت سماجت رائیگاں گئی۔ اسے مجھ سے ملنا تک بھی نصیب نہ ہوا۔

"اس اڑھائی سال کے لمبے عرصے میں میں نے جو اذیتیں سہیں" چوکیدار نے ایک سرد آہ بھر کر کہا "وہ بیان سے باہر ہیں۔ بس یہ سمجھ لو کہ جب میں اڑھائی سال کے بعد اپنے گاؤں پہنچا تو میرا سگا بھائی بھی مجھے پہچان نہ سکا۔ میں شاید اس وقت بھی وہاں سے پیچھا نہ پاتا اگر وہ داروغہ وہاں سے ریاست کے دوسرے حصے میں تبدیل ہو کر نہ چلا جاتا۔

گاؤں میں آنے پر مجھے معلوم ہوا کہ مورتو بھی اس میلہ سے نہیں لوٹی۔ وہ ضرور ہی داروغہ یا دوسرے افسروں کی خواہشات کا شکار ہوئی ہوگی۔ اس بات کا مجھے پہلے ہی شبہ تھا۔ اور میرا یہ شک درست ہی نکلا۔ جب جیل سے رہا ہونے کے ایک سال بعد تندرست ہو کر میں لاہور گیا۔"

کچھ لمحہ تک چوکیدار سامنے خلا میں دیکھتا رہا۔ اور پھر لمبا سانس بھر کر اس نے کہا۔ "گوبندا! دھوبی منڈی کی عصمت فروشوں میں میں نے مورتو کو دیکھا۔ آجکل تو یہ سب وہاں نہیں۔ اب دھوبی منڈی کی جگہ ہیرا منڈی نے لے لی ہے۔ لیکن اُن دنوں وہاں خوب رونق ہوتی تھی۔ مورتو کو اس حالت میں دیکھ کر میرا جی بھر آیا۔ وہ ایک نہایت گھنا دینے، چھوٹے سے تاریک مکان میں رہتی تھی۔ میں اس کے ساتھ گھنٹوں بیٹھا رہا۔ اس نے مجھے اپنی دردناک کہانی سنائی۔ کس طرح داروغہ اور دوسرے افسروں نے اس پر مظالم توڑے۔ اس کی سونے کی سی آب مٹی میں ملا دی۔ اور کس طرح اپنی بھوک مٹا کر ایک پچوڑی ہوئی ہڈی کی طرح اسے چھوڑ دیا۔ اپنی عصمت و عفت کو لٹا کر وہ کس منہ سے اپنے گاؤں کو جاتی۔ اس نے مجھے بتایا گوبندا کہ کس طرح مصائب برداشت کرتی ہوئی وہ لاہور پہنچی اور حالات مجبوری اور بیچارگی نے اسے ایسا نفرت انگیز پیشہ اختیار کرنے پر مجبور کر دیا۔"

یہ کہتے کہتے گوبندا! وہ رو پڑی۔" چوکیدار کا اپنا گلا بھر آیا۔ اور اس کی آنکھیں پُرنم ہو گئیں۔ داستان جاری رکھتے ہوئے اس نے کہا ——— "اس وقت میرے بھی آنسو آ گئے اور میں جی بھر کر رو دیا۔ جب دل کا بار کچھ ہلکا ہوا تو میں نے اسے اپنے ساتھ چلنے کو کہا۔ لیکن وہ کسی طرح راضی نہ ہوئی۔ جب میں وہاں سے چلنے لگا تو اس نے میرے سامنے ایک ریشمی رومال لا کر رکھ دیا۔ اور روتی ہوئی بولی۔

"تین ساڑھے تین سال سے میں نے اسے سنبھال کر رکھا ہے۔ لیکن یہ رومال آپ

مجھ سی عورت کے پاس نہ رہنا چاہئے۔ اسے اپنی نئی دُلھن کو میری طرف سے بھینٹ کر دینا۔"

اس کی یاس انگیز آواز میں کچھ ایسا رعب تھا کہ میں کچھ نہ کہہ سکا۔ اس کے گاہک ادھر ادھر چکر لگا رہے تھے۔ کئی بار وہ بے چینی سے باہر دیکھ چکی تھی۔ میری سمجھ میں نہ آ رہا تھا کہ میں کیا کروں۔ آخر دوسرے دن آنے کا ارادہ کر کے میں اٹھا۔ ایکدفعہ ہماری نگاہیں پھر چار ہوئیں۔ ہم دونوں میں سے کوئی نہ بولا۔ میں چُپ چاپ باہر نکل آیا۔ دوسرے دن وہاں گیا تو مورنو جا چکی تھی۔"

چوکیدار چُپ ہو گیا۔ کچھ لمحوں بعد گوبند نے پوچھا "تو آپ اس نوکری پر کیسے آ گئے؟"

"یہ سوال پوچھنے سے کیا حاصل ؟" چوکیدار نے لمبا سانس لیتے ہوئے کہا۔ "قسمت کا چکر تھا، ادھر لے آیا!"

"پھر بھی" گوبند نے اصرار کے لہجے میں کہا۔

چوکیدار اور بھی دھیمی آواز میں بولا "اب تو بتانے میں ہرج نہیں۔ حقیقتاً میں اس ظالم داروغہ سے انتقام لینے کی زبردست خواہش سے شملہ واپس آیا تھا۔ میں نے اپنی تمام زندگی میں ایک ہی عورت سے محبت کی تھی۔ اور اس کا نام مورنو ہے! بس اس کے بعد کسی کی طرف بھی میری نگاہیں نہ اٹھیں۔ مورنو کا جو حشر اس داروغہ کے ہاتھوں ہوا۔ اور جس طرح اس کے ہاتھوں میرے تصورات کے محل مسمار ہوئے اس سے میرے دل میں اس سے بدلہ لینے کا خوفناک جذبہ پیدا ہو گیا تھا جو ہر لحظہ میرے دل کو جلا رہا تھا۔ جس داروغہ نے ہم دونوں کو یوں جدا کر دیا اسے میں یوں سستے داموں نہ چھوڑنا چاہتا تھا۔ اس مقصد سے میں کوٹی کی پولیس میں نوکر ہوا تھا۔ لیکن" چوکیدار نے پھر لمبا سانس لے کر کہا "پرماتما نے مجھے اس پاپی کا خون کرنے سے بچا لیا۔ میرے آنے کے دو ہی دن بعد وہ سڑک پر چلا جا رہا تھا کہ بارش کی شدت کے سبب اوپر سے پہاڑ

کا ایک بڑا حصّہ اس پر گر پڑا۔ اور وہ اپنی ہوس ناکیوں کو اپنے ساتھ لئے ہوئے ہمیشہ کے لئے اس مٹی میں دب گیا۔ میرے دل میں اور کوئی آرزو ہی نہ رہی تھی اس لئے چوکیدار ہی بنا رہا۔

گوبند نے ایک سرد آہ کھینچی "قسمت کے کھیل ہیں چوکیدار صاحب، لیکن پھر آپ نے اسے تلاش نہیں کیا؟"

چوکیدار نے کہا "بہتیرا کیا لیکن وہ ملی نہیں۔ ہاں وہ ریشمی رومال آج تک میرے پاس ہے" یہ کہہ کر چوکیدار نے اندر کی جیب سے ایک رومال نکالا جو بالکل خستہ اور بوسیدہ ہو کر رہ گیا تھا۔ اس وقت سپاہیوں کے مضبوط جوتوں کی کھڑکھڑاہٹ کی آواز آئی چوکیدار نے رومال پھر وہیں جیب میں رکھ لیا اور گوبند آہستہ سے کھسک گیا۔

آرٹسٹ

پروفیسر صاحب نے کہا کہ میں بسروچشم خدمت کیلئے حاضر ہوں۔ لیکن آپ نے کی زبردستی۔ مجھ سے پوچھے بغیر دوستوں کو وعدہ دے دیا۔ ان کی دعوت کا کیا کہنا۔ سیر بھر دودھ لائے اور بیس آدمیوں کی چائے کر دی۔ زیادہ سے زیادہ چار ڈبل روٹیاں آجائیں گی۔

میں نے کہا مجھ سے غلطی ہو گئی۔ لیکن ایک خاص بات تھی جو میں نے ان کا کہا مان لیا۔ میں انھیں ممنون کرنا چاہتا تھا۔ اگر آپ پر مجھے اعتماد نہ ہوتا تو میں کبھی ہاں نہ کرتا۔ یوں تو دعوت ان کی بھی بہت بھاری ہے۔ تین تین روپے سب نے چندہ کیا ہے۔

ابا ہم دعوت کے بھوکے ہیں۔ بڑے بڑے راجا رئیسوں کے جاتے ہیں۔ ایک ایک بیٹھک کے سو سو روپے لیتے ہیں۔ یوں تو کہیں جاتے ہی نہیں جسے گانا سننے کا شوق ہو

یہاں چلا آتے۔ اس دن وہ شام بہاری دس روپئے دے رہے تھے، صرف گھنٹہ بھر کے لئے جانا تھا لیکن میں نے صاف انکار کر دیا۔

میں نے کہا "دس روپئے دینا آپ کی توہین کرنا تھا۔ ایسے ہی لوگوں نے توفن کی قدر گھٹا دی ہے۔ طبلے کا انتظام کیا ہے تم نے؟"

پروفیسر صاحب بولے "میرے پاس آجکل کوئی طبلچی نہیں ہے"

"جیتو کو لے چلیں گے"

"پہلے بتاتے تو میں انتظام ہو جاتے لیکن خیر اب جیتو کو ہی تیار کر لینا۔ دو روپئے دے دینا"

"اس کا انتظام ہو جائے گا"

"تانپورا بھی لے چلیں"

"لے چلئے۔ اس کے بغیر کیا شان ہوگی، میں چھیڑ لوں گا"

میں بھاگ کر ایک قلی کو بلا لایا۔ پروفیسر صاحب نے باجہ، طبلہ اور طنبورا اس کے حوالے کیا اور خود اچکن اور چوڑی دار پائجامہ پہن کر تیار ہو گئے۔ سر پر انھوں نے راگیوں جیسا صافہ باندھا اور ریشمی رومال جو برسوں سے اسی جیب کی زینت بنتا چلا آتا تھا اپنی جگہ رکھا، چھڑی اٹھائی اور چل پڑے راستہ میں جیتو کو ساتھ لے لیا گیا۔

پروفیسر صاحب مانے ہوئے مغنی تھے، آپ کی آواز میں سوز تھا، درد تھا، لے کتنی مشہور بھی آپ کافی تھے، لیکن حال پتلا تھا۔ مجھے اچھی طرح معلوم تھا۔ کٹڑہ بازار میں ایک چھوٹا سا کمرہ لے رکھا تھا۔ کچھ ادھر ادھر سے مانگ کر سجا بھی لیا تھا۔ کرایہ کسی نہ کسی طرح پہلے ادا کر چکے تھے۔ لیکن روٹیوں کے لالے پڑے رہتے تھے۔ گانے کے شوقین تو بہت ہیں لیکن رقم دے کر سننے والوں کی کمی ہے۔

میں نے انھیں پندرہ روپئے دلانے کا انتظام کر رکھا تھا۔

گانا ہوا۔ آپ نے اس دن کمال کر دیا۔ اتنے میں دعوت تیار ہوگئی۔ آپ اٹھ کھڑے ہوئے۔ میں نے کہا "کھانا تو کم از کم یہیں کھائیے گا؟"

"میری طبیعت کچھ خراب ہے۔ میں نہ کھا سکوں گا۔"

بہت زور دینے پر بھی پروفیسر صاحب نہ مانے۔ میں نے جستو کو دو روپے دلا دیئے اور سکریٹری کو اشارہ کیا۔ اس نے آپ کا بہت شکریہ ادا کرتے ہوئے پندرہ روپے کے نوٹ آپ کو پیش کئے۔

پروفیسر صاحب نے انھیں واپس کر دیا اور کہنے لگے "اگر آپ کو میری ٹیکسی ہی مقصود تھی تو مجھے یہاں لائے ہی کیوں۔ میں تو محض دوستی کی خاطر چلا آیا ورنہ پچاس سے ایک کوڑی کم نہ لیتا۔ پندرہ تو کیا دو دو روپے میں بہت سے آنے والے ہیں انھیں بلا لیتے۔"

میں نے معذرت کی، پروفیسر صاحب چلے گئے۔

اسی روز شام کو میں نے دیکھا جستو نے ہوٹل میں روغن جوش اور پلاؤ کی پلیٹیں منگوائیں، پیگ بھی چڑھایا، جب پروفیسر صاحب سے ملا تو ان کا چہرہ اترا ہوا تھا انھوں نے کھانا بھی نہ کھایا تھا۔

میں نے پوچھا "آپ نے کھانا نہیں کھایا آج؟"

"طبیعت خراب ہے۔"

او رکچھ د د. جا کر مجھے بانو نہیں مصروف دیکھ کر آپ نے دو پلیٹ گرم گرم چنے لئے اور ایک دو چھینٹے مار کر جلدی جلدی چلے گئے۔ مجھے اچھی طرح معلوم ہے اگر میں چنے خریدنے کے بارے میں پوچھتا تو آپ جواب دیتے:

"زکام ہے۔ گرم چنوں کو سونگھنے سے آ۔ ام ہو جاتا ہے۔"

ایک جھلک

کچھ دن بعد ہی انست کو چیتن کا ایک اور خط ملا جس میں کسی لڑکی پر کا شو کا ذکر تھا۔

"تمھیں ایک دلچسپ بات سناتا ہوں" چیتن نے لکھا تھا "ہمارے مکان کے سامنے ایک تانگے والا رہتا ہے۔ جس مکان میں وہ رہتا ہے اگرچہ وہ دو منزلہ ہے لیکن پھر بھی اسے مکان کا نام دینے میں جھجک ہوتی ہے ——— ایک کوٹھڑی اور ایک چھوٹا سا آنگن اوپر کی منزل میں ہے اور دو اندھیری کوٹھڑیاں نچلی منزل میں۔ اوپر کی منزل میں تانگے والے کا کنبہ رہتا ہے اور نچلی منزل میں رحیم چنگڑ جس کی بیوی واقعاً صبح سے لیکر شام تک ایسی ایسی طبعزاد گالیاں دیتی ہے کہ روح کانپ جاتی ہے۔ کم بخت نے ایسے غضب کا دماغ پایا ہے کہ ایک گالی سے دوسری گالی کبھی نہیں ملتی۔

"تانگے والے کی ایک ماں ہے، بہن ہے اور دو چھوٹے بچے ہیں۔ میں دیکھ رہا ہوں

کہ اس کی یہ بہن کچھ دنوں سے مجھ میں دلچسپی لینے لگی ہے۔ جب میں اپنے کمرے میں بیٹھا لکھا کرتا ہوں تو وہ کھڑکی میں آجاتی ہے۔ یہ کھڑکی ایک کھلا سا بڑا جھروکہ ہے۔ کواڑ یا سلاخیں اس میں نام کو نہیں۔ دھوپ تیز ہونے پر بھی وہ اس جھروکے میں بیٹھی رہتی ہے۔

موٹی، بدنما اور پھوہڑ ـــــ اسے عشق کرنے کو بھی اور کوئی نہیں ملا لیکن اننت دل ہی تو ہے۔

اور پھر جب دن بھر دفتر میں چیف ایڈیٹر کی جھڑکیاں اور ڈانٹ سن کر شام کو گھر واپس آتا ہوں اور وہ اپنے جھروکے میں بیٹھی اپنے موٹے موٹے ہونٹوں پر میٹھی مسکراہٹ لاکر میرا خیر مقدم کرتی ہے تو اننت جی ہرا سا ہو جاتا ہے۔ اور اس نامعقول ایڈیٹر کی باتوں سے دل پر ہونے والے زخم بھر سے جاتے ہیں۔

اس پیرا کا شو کے متعلق چیتن نے کچھ ایسی باتیں کہیں کہ اننت جب ایک بار اپنے بہنوئی کے پاس پنڈی گیا تو آتے آتے لاہور اتر گیا۔

ڈھونڈتا ڈھونڈتا وہ بنگالی گلی میں چیتن کے دفتر پہنچا لیکن اتوار ہونے کی وجہ سے دفتر بند تھا۔ تب پیپل وہڑا چابگر محلہ کا پتہ پوچھتا پوچھتا وہ چل پڑا۔

صبح کا وقت تھا اور اگرچہ میونسپل کمیٹی کے بھنگی اور بہشتی اپنا فرض پورا کر گئے تھے لیکن گندگی کی گاڑیاں بھی اپنے فرائض بوجہ احسن سرانجام دے رہی تھیں۔ درحقیقت گھوڑوں کے اصطبلوں، گندی گاڑیوں کے اڈوں، گوجروں، چنگڑوں، بھنگی اور چماروں کے گھروں کے نزدیک ہونے کی وجہ سے بہشتی خواہ لاکھ چھڑکاؤ کریں اور بھنگی خواہ لاکھ صفائی کر جائیں چابگر محلہ کی حالت میں کبھی فرق نہیں آتا۔ انارکلی کے نزدیک ہی اتنا بے رونق گندہ اور مفلوک الحال علاقہ ہو سکتا ہے، اننت نے خواب میں بھی یہ نہ سوچا تھا۔ وہ چابگر محلہ میں پہنچنے

دُکانیں بن گئی ہیں اور رونق میں بھی اضافہ ہوگیا ہے۔ لیکن اس وقت تو سارے بازار میں دو تین لانڈریوں ایک "میلے کچیلے بنیے" اور دو ایک ہندو اور مسلمان حلوائیوں کی غلیظ دوکانوں کے سوا کچھ نہ تھا۔

موہن لال روڈ کی طرف سے داخل ہو کر، ناک پر رومال رکھے، کسی نہ کسی طرح چیتن پیپل وہڑا کو جانیوالی گلی کے سرے پر آکھڑا ہوا۔

گلی پختہ اینٹوں سے بنی ہوئی تھی اور بازار سے کچھ اونچی تھی۔ سامنے ایک سہ منزلہ اونچا مکان تھا جس کی کھڑکیاں گہرے سرمئی رنگ کی تھیں۔ اننت نے اطمینان کا سانس لیا کہ آخر وہ اچھی طرح صاف جگہ پہنچ گیا لیکن جب لالہ بھگوان داس کا مکان پوچھتا پوچھتا وہ چند قدم چل کر اس کے سامنے والے نئے مکان سے ہوتا ہوا دائیں طرف تنگ گلی کو مڑا تو اس نے اچانک پھر ناک پر رومال رکھ لیا۔ گوبر کی ایک تیکھی بو اس کی ناک میں گھس گئی اور اس کے ساتھ ہی کسی کی کرخت آواز اس کے کانوں میں پڑی جس کے ایک فقرے میں قریباً سب کی سب گالیاں تھیں۔

ایک دو پکے مکانوں کے علاوہ اس گلی میں سب مکان کچے ہی تھے جن میں جنگڑ رہتے تھے۔ اس تنگ سی گلی کا نام دراصل پیپل وہڑا تھا۔ اور یہیں لالہ بھگوان داس نے اپنے ساہوکارے کی بدولت اصل اور سود ملا کر ان جنگڑوں ہی میں سے کچھ کی جھونپڑیاں مول لے کر یا قرق کروا کر دو تین پکے مکان بنوا لئے تھے۔

گلی کے سرے پر ہی، اپنے کچے مکان کی دہلیز میں، ایک کالا بھجنگ جنگڑ بیٹھا مزے سے حقہ گڑگڑا رہا تھا۔ اننت نے اس سے لالہ بھگوان داس کے مکان کا پتہ پوچھا۔ اور جب اس نے حقہ گڑگڑاتے ہوئے سامنے والے تین منزلہ پکے مکان کی طرف اشارہ کر دیا تو اننت نے اس مکان کے پاس جا کر چیتن کا نام لیکر آواز دی۔

کسی زمانہ میں یہاں شاید کھلی جگہ چوک یا آنگن ہوگا۔ ہو سکتا ہے پیپل کا کوئی درخت

بھی ہو۔ لیکن اس وقت تو دونوں میں سے کوئی چیز وہاں موجود نہ تھی۔ مکان کے ساتھ دس بارہ فٹ کھلی جگہ تھی، جسے ایک کندھوں تک اونچے کچے پردے کے ذریعے گلی سے الگ کر دیا گیا تھا۔ یہ جگہ پکی تھی۔ اور اس کے عین وسط میں ایک نالی تھی جس کے ذریعے مکان کا سب گندا پانی گلی کی بدرو میں جا ملتا تھا۔ اس نالی کی جو حالت تھی اس سے اننت نے مکینوں کی تہذیب اور زندگی کے معیار کا کچھ کچھ اندازہ لگا لیا۔

رہا مکان ـــــ تو تین منزلوں میں سے نچلی منزل کے وسط میں ایک ڈیوڑھی تھی جس کے پرے تنگ اور تاریک سا آنگن دکھائی دیتا تھا۔ اس ڈیوڑھی کے دونوں طرف سیڑھیاں چڑھتی تھیں جس سے معلوم ہوتا تھا کہ مکان دو حصوں میں منقسم ہے۔ (حالانکہ یہ مکان تین حصوں میں منقسم تھا۔ اور ان تین حصوں میں نو کرایہ دار رہتے تھے۔ لیکن اس بات کا اننت کو بعد میں پتہ چلا۔) اس نچلی منزل میں ڈیوڑھی کے دونوں طرف دو دو دروازوں والے دو کمرے تھے۔ ان کے اوپر دوسری منزل میں دو اور کمرے تھے ـــــ جن کی میلی کھڑکیاں زبانِ حال سے اپنی زبوں حالی کی فریاد کر رہی تھیں۔ تیسری منزل پر اننت کو اینٹوں کے پردے ہی دکھائی دیئے ـــــ لالہ بھگوان داس کا یہ مکان ان ہزاروں مکانوں میں سے ایک تھا جو لاہور کے مالک مکان غریب کرایہ داروں کیلئے بناتے ہیں۔

اننت کی آواز سن کر دائیں طرف کے نچلے کمرے سے (جس کے دروازوں پر گہرے زرد رنگ کی نئی چقیں لٹک رہی تھیں) چیتن نکلا۔ کمر تک جسم ننگا تھا اور اس کے بعد تہمد لٹک رہا تھا۔

اننت کو دیکھ کر اور مسرت کی ایک "اوہ" کر کے ہاتھ ملاتا ہوا چیتن اسے اندر لے گیا۔ نیم تاریک کمرہ جس کی دیواروں کی سفیدی، ایسا معلوم ہوتا تھا کہ نہیں کہاں چاٹ گئی ہے۔ چقوں والے ان دو دروازوں و آنگن میں کھلنے والے ایک اور دروازہ کے

علاوہ (جو اس وقت بند تھا) ایک روشن دان تک اس کمرے میں نہ تھا۔ بند سیل بھرے نمدار کمروں سے جیسی بو سی آنے لگتی ہے ویسی ہی نمکین گلا گھونٹنے والی سی بو اس کمرے سے آ رہی تھی۔ کمرے میں کوئی الماری نہ تھی یونہی دو جگہ طاق بنا کر تختے لگا دیئے گئے تھے۔ چھت کی کڑیاں دھوئیں سے کالی سیاہ ہو رہی تھیں جس سے معلوم ہوتا تھا کہ پہلا کرایہ دار یہاں ضرور رسوئی بھی پکاتا ہوگا۔ نیچے سیمنٹ کا فرش تو تھا لیکن اس میں پیوند لگے تھے۔ بالکل صاف تھا۔ اور جینتی کے ننگے بدن کی گرد بتا رہی تھی کہ اس نے ابھی ابھی اسے صاف کیا ہے۔ فرنیچر کے نام پر ایک طرف کونے میں ایک سیاہ میز تھی ——— اسی کے پاس بازوؤں کے بغیر ایک کالی گدے دار کرسی۔ روشنی کیلئے دیوار میں میخ گاڑ کر ایک بجلی کا بلب لگایا گیا تھا۔

"یہ میز کہاں سے لائے ہو؟" اننت نے پوچھا "بڑی تو خوب ہے۔ اور ہے بھی شاید آبنوس کی لکڑی کی۔ . . . لیکن معلوم تو سکنڈ ہینڈ ہوتی ہے؟"

"ہاہا تھرڈ ہینڈ" جینتی نے قہقہہ لگاتے ہوئے کہا "میں تو ایک کباڑیئے کی دوکان سے گیارہ روپئے میں اٹھا لایا تھا" پھر قدرے فلسفیانہ انداز میں اس نے کہا "ہم سب ایک دوسرے پر انحصار رکھتے ہیں اننت! ہمارا اُتارا غریب بڑے شوق سے قبول کرتے ہیں۔ اور امیروں کا اُتارا ہم!" اور وہ ایک کھوکھلی سی ہنسی ہنسا۔

اننت نے اور نزدیک ہو کر دیکھا تو گاڑھے روغن اور پولشن کی امداد سے کئی جوڑ ڈھکے ہوئے دکھائی دیتے۔ نہ جانے کتنی بار مرمت ہو کر یہ میز اور کرسی اس ہونہار اولوالعزم مصنف کے یہاں پہنچے تھے۔

"اندر ہی آجاؤ"

اننت نے خیال ہی نہ کیا تھا کہ اندر بھی کوئی کمرہ ہے۔ اُس کمرے کے کواڑوں کو کھول کر جینتی اندر گیا۔ بجلی کا بٹن اس نے دبایا۔ اننت نے دیکھا کہ ایک اندھیری کوٹھڑی ہے

چیز کی سامنے کی طرف وائیں دیواریں پہلے کمرے جیسے ہی طاق ہیں۔ بائیں دیوار میں ویسا ہی ان گھڑ کواڑوں کا دروازہ ہے جو شاید کسی دوسرے کمرے میں کھلتا ہے۔ ایک طرف ایک سستی سی چارپائی پر نہایت صاف بستر بچھا ہوا ہے۔ نمی کی بو یہاں پہلے کمرے سے بھی زیادہ ہے۔ روشندان تو دور رہا ایک سوراخ تک بھی کہیں نہیں اور دیواروں کا پلاستر بہت جگہ سے تڑخ چکا ہے ـــــــ ہاں ٹھنڈک اس کوٹھڑی میں نسبتاً باہر سے زیادہ ہے۔ اننت چپ چاپ چارپائی پر لیٹ گیا۔

لیکن زیادہ دیر تک وہ وہاں لیٹا نہ رہ سکا۔ دوپہر کو غالباً اس کمرہ میں ٹھنڈک زیادہ ہوتی ہوگی۔ لیکن صبح صبح اس میں حبس زیادہ تھا۔ وہ اٹھ کر باہر آیا۔ چیتن نے دیوار کے ساتھ لگی ہوئی آرام چیئر بچھا دی اور وہ اس پر آرام سے لیٹ گیا۔ تبھی سامنے کے مکان کی کھڑکی میں ایک لڑکی آکھڑی ہوئی۔

چیتن نے آہستہ سے کہا "پرکاشو!"

لیکن کسی اجنبی کو چیتن کے پاس بیٹھا دیکھ کر وہ فوراً چلی گئی۔

غسل وغیرہ سے فارغ ہو کر جب گنپت روڈ کے نورنما ہوٹل سے چیتن اپنے اس بچپن کے دوست کو کھانا کھلا لایا تو دونوں اندر کی چارپائی کو باہر نکال کر اس پر لیٹ گئے۔ اور پھر وہیں لیٹے لیٹے چیتن نے اسے اپنے مکان کا کچھ تعارف کرایا۔

پانچ چھ مہینے سے ہو گئے اس تین منزلے مکان میں دس کرایہ دار رہتے تھے۔ آنگن میں ہینڈ پمپ لگا تھا اور چونکہ کمیٹی کا نل ابھی مکان میں نہ لگا تھا اور کوئی کامن باتھ روم وہاں تھا نہیں اس لئے وہ ہینڈ پمپ غسل خانہ کا بھی کام دیتا تھا۔ اگرچہ چیتن ڈول سے بالٹی بھر کر اپنے اس ڈرائنگ روم میں ہی نہاتا تھا۔

اس ہینڈ پمپ کے سامنے دو کوٹھڑیوں میں رنگ ساز لڑکے رہتے تھے جو دن بھر

فیکٹری میں کام کرتے تھے اور رات کو سونے کے لئے وہاں آجاتے تھے۔ چیٹرجی کے کمرے کے سامنے دوسرے حصے میں ایک حلوائی رہتا تھا جس کی بیوی نے اس کمرے کو ایک چھوٹا موٹا مندر بنا رکھا تھا۔ غریب چینگڑوں کے گاڑھے پسینے کی کمائی سود در سود میں ان کے یہاں آرہی تھی۔ اور ان کے بوسیدہ کپڑوں کے تار ان کے ریشمی ملبوسات میں بدل رہے تھے۔ پھر چینگڑوں کی ایک دو جھونپڑیوں کی جگہ ان کا مکان بن گیا تھا اور اس میں کچھ مشتبہ قسم کے لوگ رہتے تھے (ایک عورت تھی، چلتی پھرتی سی، اس کے پاس کچھ نوجوان لڑکیاں تھیں اور رات کے تاریک سایوں میں چھپ کر کچھ لوگ نت وہاں آیا کرتے تھے۔) اس کے علاوہ اس کی بڑھتی ہوئی جائداد کو سنبھالنے والا کوئی نہ پیدا ہوا تھا ——— ان ہی سب باتوں کی وجہ سے صبح شام وہاں بھگوان کی پوجا میں گھنٹے گھڑیال بجا کرتے تھے۔

دوسری منزل میں چیٹرجی کے عین اوپر، بھارت انشورنس کمپنی میں کام کرنے والا ایک کلرک اور اس کا ساتھی رہتے تھے۔ اور ان میں سے ایک کی ماں بھی ساتھ تھی۔ رسوئی خانہ چونکہ تھا نہیں اس لئے اوپر کی منزل ہی میں وہ رسوئی بناتے تھے۔ اور جس دن مطلع کبھی ابر آلود ہوتا اور ہوا چلتی تو ان کے رسوئی کا ڈرائنگ روم کا دھواں چیٹرجی کے اس پائخ روم نما ڈرائنگ روم میں آجاتا تھا۔

ڈیوڑھی کے اوپر آدھے حصے میں آنگن اور پچھلی دو کوٹھڑیوں میں ایک کمپاؤنڈر اس کی بیوہ بہاوج اور اس کے بچے (دس بارہ برس کی ایک لڑکی اور سات آٹھ سال کا ننھا لڑکا) کسی نہ کسی طرح زندگی کے دن گزار رہے تھے۔

حلوائی کے اوپر دو کمروں میں پرائمری اسکول کا ایک ماسٹر رہتا تھا۔

تیسری منزل پر تینوں حصوں میں ایک ایک برساتی بنی ہوئی تھی جن میں بالترتیب ایک خوانچے والا، ایک ڈاکیہ، ایک پنواڑی مع اہل و عیال کے رہتے تھے اور جلتی دھوپ ہو یا چبھتی سردی یا کھلا برساتی کے تنگ چھت پر پردہ کر کے بنایا کرتے تھے۔

ان سب نو دس کرایہ داروں کیلئے صرف تین کامن بیت الخلا تھے۔ بیٹھنے اٹھنے کھانے سونے، نہانے دھونے کا کام سب اپنے اپنے کمروں سے لیتے تھے۔

گرمیوں میں سونے کا انتظام یوں ہوتا ______ نچلی منزل والے پرلے مکان کے درمیان کھلی جگہ میں اس گندی نالی کے اوپر سوتے۔ درمیان کی منزل میں رہنے والے برساتیوں کے اوپر اور برساتیوں کے مکین اپنی برساتیوں کے آگے۔

اس مکان اور اس کے مکینوں کا تعارف کرانے کے بعد چیتن نے کہا۔

"تمہیں یہ سن کر حیرانی ہوگی کہ یہ دو کمرے بھی مجھے بڑی مشکل سے ملے۔ لاہور کی گلیوں، محلوں میں کسی مجرد کیلئے کوئی کمرہ کرایہ پر لے لینا آسان بات نہیں۔ ساتھ کوئی عورت ہونی چاہئے۔ خواہ ماں، بہن، چچی، نانی، خالہ، پھوپھی، بیوی، بھاوج یہاں تک کہ کہیں سے بھگا کی ہوئی کیوں نہ ہو۔"

یہاں چیتن نے ایک قہقہہ لگایا اور بولا "لیکن میں نے بھی ان لوگوں کو خوب بنایا۔ تمہیں یاد ہوں گے ہنر صاحب۔ وہی جو دنیا بھر کے شعرا کی چیزیں اپنے نام سے سنا کر جالندھر میں خود پر عجب غالب کر آئے تھے۔ ارے وہی انہیں دل ہی دل میں میں نے گرو بھی دھار لیا تھا۔ وہ اس عقیدت کے طفیل پانچ روپے بھی جن کی نذر کر دیتے تھے۔ انہوں نے یہاں پر رہتے پنجاب ہندو ہوٹل چھوڑنے کے بعد کچھ دن قیام کیا۔ دوسرا کوئی واقف نہ تھا اس لئے) لیکن جب دینے کے بعد ہنر صاحب نے بتایا کہ انہیں سولہ روپے مکان کا کرایہ دینا پڑتا ہے تو دو روپے مجھ سے مانگ لئے۔ وہ یہ پیش کش بھی کہ کھانا بھی میں انہی کے ساتھ کھایا کروں اور اس سب کے صرف [illegible] ہیں۔ روپئے وہ مجھ سے لیا کریں گے۔ اور [illegible] انداز میں کہا کہ اپنا ساتھ ہو تو یاری [illegible] ہمیں بھی امداد ہو جاتی ہے ______ تو اس دن شام کو میں دوسرے مکان کی تلاش میں نکل پڑا۔ یہ بھی [illegible] پاس ہی مل جائے تو رات کو دیر سے آؤ [illegible]

چل کر مرتک پہنچنے کی مصیبت سے بھی نجات ملے ——— لیکن پانچ چھ جگہ پوچھنے پر ہی پتہ چل گیا کہ مہذب علاقے میں کسی کنوارے کیلئے کمرہ لے لینا کچھ ناممکن سا ہے۔

"اس چینگر کا محلہ میں بھی؟" چیتن نے ہنس کر کہا "ادھ چھتے آنگن پر رہنے والی بیوہ نے پوچھا کہ میں اکیلا ہی ہوں یا ایک عدد بیوی بھی پالے ہوئے ہوں۔ تب میں نے کہہ دیا کہ بیوی میرے ہے لیکن چونکہ اس کو ابھی امتحان دینا ہے اس لئے میرے ساتھ نہ آئے گی"

اننت نے ہنس کر کہا "لیکن اب تو امتحانات ہو چکے؟"

چیتن بولا "پوچھتی تھیں لیکن میں نے کہہ دیا کہ میری بیوی صوبہ بھر میں اوّل رہی ہے اس لئے اسے امتحان دیتے ہی اسکول میں ملازمت مل گئی ہے۔ اب میں کوشش کروں گا کہ اس کی بھی تبدیلی لاہور ہی میں ہو جائے"

اس پر دونوں دوستوں نے قہقہہ لگایا۔ اس وقت اننت نے دیکھا کہ وہ لڑکی وہ پرکاشو چپ چاپ جھروکے میں آکر کھڑی ہو گئی ہے۔ درحقیقت ایک دروازے کی چق قدرے نیچی لگی ہوئی تھی۔ اچانک لگ گئی تھی یا چیتن نے دیدہ و دانستہ اسے اس طرح لگایا تھا کہ اس میں سے جھروکے میں بیٹھا ہوا آدمی بخوبی دکھائی دے سکے ——— یہ نہیں کہا جا سکتا۔ لیکن وہیں سے اننت نے اس لڑکی کو دیکھا۔

وہیں لیٹے لیٹے اس نے کندھے کا ٹھوکا دیکر چیتن کی توجہ اس طرف مبذول کی۔

آہستہ سے چیتن نے کہا "تم یہیں لیٹے رہو شاید وہ تمہیں نہیں دیکھ رہی"

اس کے بعد دو گھنٹے تک جو کچھ ہوا اس کے نتیجے کے طور پر اننت نے یہ تنویہی دیدیا کہ لڑکی کو چیتن سے عشق کی حد تک محبت ہے۔ اور جب چیتن نے اسے بتایا کہ دوسرے نلکوں کو چھوڑ کر اب پرکاشو کچھ دنوں سے ان کے ہینڈ پمپ پر ہی پانی بھرنے لگی ہے۔ کیونکہ گھر والوں کو اس نے یقین دلایا ہے کہ کمیٹی کے نلکوں کی بہ نسبت ہینڈ پمپ کا پانی

زیادہ ٹھنڈا ہوتا ہے) تو اننت نے مشورہ دیا کہ آج جب وہ پمپ پر پانی لینے آئے اسے پکڑ کر بس فوراً لے آنا چاہئے۔ وہ تو تمہاری آغوش میں آنے کیلئے جھٹپٹا رہی ہے"
اس نے کہا "تم جرأت سے کام نہ لوگے تو یہ معاملہ آگے نہ بڑھے گا"

لیکن چینن کا دل بے طرح دھڑک رہا تھا۔ تب اننت نے ڈیڑھ گھنٹے تک محبت کے معاملے میں اپنے حوصلہ اور دلیری کی جو داستانیں سنائیں ان کا نتیجہ یہ ہوا کہ دھڑکتے ہوئے دل کے ساتھ چینن اس جرأت رندانہ کیلئے تیار ہو گیا۔

عام طور پر پرکاشو شام سے بہت پہلے ہی آتی تھی جب عموماً ساتھ کی حلوائن اور اوپر رہنے والی بیوی اپنے بچوں کے ساتھ سو رہی ہوتیں۔ اور آنگن میں سناٹا ہوتا ——— اس کے آنے سے پہلے اننت نے چینن کو اس طرح تیار کیا کہ وہ آنگن میں کھلنے والے اپنے دروازے میں کھڑا رہے گا۔ خود اننت دروازے کی اوٹ میں بیٹھا رہے گا اور کوئی ایسی ویسی بات ہوئی تو سنبھال لے گا۔

جب پرکاشو وقت پر پانی لینے آئی اور بالٹی پمپ کے نیچے رکھ چکی اور چینن کی طرف ایک دو بار انکھیوں سے دیکھ کر مسکرا بھی چکی تو اننت نے کہنی کے ٹھوکے سے چینن کو جانے کیلئے کہا۔ اگرچہ اس نے تین چار بار چینن کی کمر میں کہنی کا ٹہوکا دیا مگر چینن ٹس سے مس نہ ہوا۔ اور پانی بھرنے کے بعد پرکاشو بالٹی اٹھا کر اپنے موٹے ہونٹوں سے مسکراتی اور اپنے بھاری کولہے مٹکاتی ہوئی چلی گئی۔

تب اننت نے خالص دوآبے کی زبان میں اننت کو بے شمار "میٹھے وچن" سنائے اور فتویٰ دیا کہ وہ بالکل نامرد ہے۔

شاید یہ لفظ سنتا چینن کی مردانگی کو گوارا نہ تھا۔ اس لئے جب پرکاشو دوسری بار آئی۔ اور دزدیدہ نگاہوں سے دیکھتے اور اپنے موٹے ہونٹوں سے مسکراتے ہوئے اس نے ایک دو بار ہینڈل گھمایا تو چینن نے ایک بارگی جست بھری۔

”ہائے میں مر گئی“ کہتی ہوئی پر کاشو ہینڈل چھوڑ وہیں بیٹھ گئی۔ چینتن کے چہرے پر گویا سیاہی پُت گئی۔ اور اس کے بازو کھلے کے کھلے رہ گئے۔

فوراً وہ پیچھے کو ہٹا اور خالی بالٹی لیکر پر کاشو چلی گئی۔

کمرے میں آکر بیس گالیاں تو چینتن نے اننت کو دیں۔ اور کہا کہ اگر کسی نے دیکھ یا سن لیا یا پر کاشو نے گھر جا کر کہہ دیا تو کیا ہوگا؟ سنبھال سنبھال کر رکھی ہوئی آبرو پہ پانی پھر جائے گا۔ بے آبرو ہو کر محلے سے الگ نکلنا پڑے گا۔ دفتر کے پاس جگہ نہ ملے گی اور پھر مکان ڈھونڈھنے کی مصیبت الگ گلے پڑ جائے گی۔ اور بیوی اس کے اب بھی کوئی نہیں۔

اننت نے دیکھا کہ چینتن کا چہرہ کپاس کے پھول کی طرح زرد ہو رہا ہے۔ اس کا رنگ فق ہے اور پاؤں کانپ رہے ہیں۔ تب ایک کیلے کا چھلکا کہیں سے لا کر اس نے آنگن کے درمیان رکھ دیا۔ اسے پاؤں سے مسل دیا اور چینتن کو تسلی دیتے ہوئے کہا کہ اول تو پر کاشو گھر جا کر کہے گی نہیں۔ اور اگر اس نے یہ حماقت کی بھی اور تم سے کسی نے پوچھا تو تم یہ کہہ دینا کہ میں باہر جا رہا تھا کیلے کے چھلکے پر پاؤں پھسل گیا۔ بازو میں نے ضرور پھیلائے تھے اور پکڑنا بھی میں نے چاہا تھا لیکن وہ تو گرتے ہوئے کی مجبوری تھی۔

لیکن چینتن کو اس سے کچھ تسلی نہیں ہوئی۔ یہ اور بات ہے کہ پر کاشو نے گھر جا کر کچھ نہیں کہا۔

ہار جیت

لال چند

جب رات دن ایک کر دینے کے باوجود بھی میں کمپارٹمنٹ میں ہی آیا تو کبھی روز تک گھر سے باہر نہ نکلا۔ نیل نے بہت نمبر حاصل کئے تھے۔ وہ فرسٹ ڈویژن میں آیا تھا۔ رادھا رانی دوسرے درجے میں پاس ہوئی تھی۔ لیکن میں بی اے کا دریا عبور نہ کر سکا۔ میری ناؤ منجدھار ہی میں رہ گئی۔ ریاضی سے مجھے چڑ ہے۔ سہ ماہی اور نو ماہی امتحانوں میں کبھی پاس نہیں ہوا۔ وہ نمبر کم ہی رہتے۔ لیکن سالانہ امتحان میں پاس ہونے کی مجھے پوری امید تھی۔ حساب اور الجبرے کے مشکل سوالوں سے مغز پچی کرتا رہا۔ دن رات محنت کی لیکن نتیجہ کچھ بھی نہ نکلا۔ ریاضی میں کمپارٹمنٹ آ گیا۔ میری ہمت ٹوٹ گئی

دو تین دن تک کچھ نہ کھایا۔ آخر دوستوں کے سمجھانے بجھانے پر طبیعت کو سنبھالا اور پھر کتابیں لے بیٹھا۔ لیکن پڑھے کون۔ بہتیری کوشش کی۔ سب بے سود۔ مطالعہ سے جی گھبراتا تھا۔ امتحان پہاڑ کی اس چوٹی کی مانند معلوم ہوتا تھا جس پر چڑھنا دشوار ہو۔ ایک سڑک تھی جو افق میں جا کر گم ہو جاتی تھی۔ میں کش مکش میں پڑ گیا۔ دل ڈانواں ڈول ہو گیا۔ کئی دن اس حیص بیص میں گذر گئے۔

تاریکی میں اچانک روشنی کی شعاع نظر آئی۔ ڈوبتے کو تنکے کا سہارا مل گیا۔ رتی موہن لاہور کے مشہور آرٹسٹ تھے۔ انھوں نے میری بنی ہوئی تصاویر دیکھیں تو پھڑک اٹھے۔ کہنے لگے دوست! تم تو بڑے بڑے مصوروں کے کان کاٹتے ہو۔ کس طرف دماغ سوزی کر رہے ہو۔ ادھر کیوں نہیں آتے۔ آجکل تعلیم آرٹ کے پانی بھرتی ہے۔ پڑھ کر کیا لو گے۔ مصور بن جاؤ گے تو عزت کے ساتھ دولت بھی پاؤں چومے گی۔

بات ٹھیک تھی۔ دل میں اتر گئی۔ لیکن میری کشش دپیچ دور نہ ہوئی۔ ایک ہفتے تک جو اُدھیڑ بن رہی دل ہی جانتا ہے۔ کبھی خیال آتا کمپارٹمنٹ کا امتحان دے کر رادھارانی کے ساتھ ایم اے میں داخل ہو جاؤں۔ اور انگریزی میں کپل کشور کو مات دیدوں۔ کبھی سوچتا مصور بن جاؤں اور اپنی شہرت کا ڈنکا چار دانگ عالم میں بجا دوں۔ اس دوراہے پر ٹھٹک سا گیا۔ کدھر جاؤں۔ کون سا راستہ اختیار کروں۔ فیصلہ نہ کر سکا۔

بچپن سے ہی مجھے تصویر کشی کا شوق ہے۔ میری کاوشوں کے اولین نمونے ابھی تک اسکول کے ہال میں لگے ہوئے ہیں۔ کالج میں بھی میری تصاویر محفوظ پڑی ہیں۔ سوچتا مصور کا پیشہ ہی کیوں نہ اختیار کر دوں۔ آخر امتحان ہی تو دنیا میں ترقی کا راستہ نہیں۔ بڑے بڑے شاعر، مصنف، سائنس داں یونیورسٹی کے امتحانوں میں پاس نہ ہو سکے تھے۔ لیکن پھر بھی دنیا میں ان کا نام روشن ہو گیا۔ پھر بھی لوگ ان کی قدر کرتے ہیں۔ میں نے اس مسئلے پر اچھی طرح غور کیا۔ مصور بننے میں مجھے شہرت اور کامیابی کی پوری امید تھی

اور رادھا کی محبت حاصل کرنے کا یقین کامل!

رادھا راجی بمل سے محبت کرتی تھی۔ وہ اس کی عقل و خرد کی مداح تھی۔ مجھے بمل پر رشک آتا تھا۔ اگرچہ میں رادھا کا دیوانہ نہ تھا لیکن میں یہ بھی برداشت نہ کرسکتا تھا کہ وہ اس سے محبت کرے۔ رادھا کو مصوری کا شوق تھا۔ بارہا وہ کالج کے مقابلوں میں میرے برابر رہی تھی۔ اب مجھے اپنے جوہر دکھانے کا موقع ملے گا۔ جب اخبارات میرے فن کی تعریف کریں گے۔ جب لوگ میرے ہاتھ کی تصاویر دیکھنے کیلئے بیتاب ہوا کریں گے۔ تو رادھا کو معلوم ہوگا کہ بی۔اے میں فرسٹ ڈویژن حاصل کرلینا ہی بڑا تیر مار لینا نہیں۔ میں تاریک راہ کو چھوڑ کر روشن راستے کی طرف ہولیا میٹھی اور مجرب دوا کے ہوتے کڑوی کسیلی دوائیں پیتا۔ مال روڈ پر رمنی موہن کی دکان کا ایک کمرہ لیکر کام کرنے لگا۔

ایک مہینے بعد ہی ملک کے مشہور ہندی اردو ماہناموں میں میری تصاویر شائع ہوئیں۔

بمل کشور

بارہا سوچتا ہوں۔ بارہا عہد کرتا ہوں رادھا سے نہ ملوں گا۔ اسے شکل تک نہ دکھاؤں گا۔ لیکن جب وقت آتا ہے خاموشی سے ادھر جا نکلتا ہوں جیسے کوئی بات ہی نہ تھی۔ جیسے کوئی رنجش ہی نہ تھی۔ سوچتا ہوں اگر وہ نہ ہوتی تو کیا بمل کشور ہوتا؟ کہیں ایف۔اے میں ایڑیاں رگڑتا ہوگا۔ بی۔اے میں فرسٹ ڈویژن میں پاس نہ ہوتا۔ اسے دیکھ کر اس سے باتیں کرکے مجھ میں قوت سی آجاتی ہے۔ اتنا پڑھتا ہوں مگر پھر بھی نہیں تھکتا۔ دسویں جماعت میں تیسرے درجے میں آیا تھا۔ لیکن ایف۔اے میں جونہی اسے دیکھا معلوم ہوا کسی نے مُردہ جسم میں روح پھونک دی ہے۔ اتنی محنت

ساری عمر نہ کرتا۔ وہ کبھی پڑھتی میں بھی پڑھتا۔ اس کے ساتھ مطالعہ کرنے میں کتنا لطف آتا! کتنا زیادہ یاد ہوتا۔ مگر نہیں اب وہ مغرور ہوگئی ہے۔ اسے خیال ہے کہ میں اس کے بغیر نہیں رہ سکتا۔ گویا اگر وہ نہ ہوگی تو میں ایم۔ اے پاس نہ کر سکوں گا۔ ورنہ وہ میری معمولی سی آرزو کو یوں رد نہ کر دیتی۔ میں نے اس کی ہر خواہش کو اس کی ہر فرمائش کو اس کے حکم کی طرح پورا کیا۔ اسے کبھی شکایت کا موقع نہ دیا لیکن اس نے معمولی سی بات بھی نہ مانی۔

صبح میں اس کے مکان پر گیا۔ وہ تصویر بنا رہی تھی۔ میں ڈرائنگ روم میں بیٹھنے کی بجائے اس کے کمرے میں چلا گیا۔ اس کے والد تحصیلدار تھے۔ اب ریٹائر ہو گئے ہیں۔ انھوں نے لاہور میں ہی بنگلہ بنوایا ہے۔ میں ان کے ہاں بے روک ٹوک چلا جاتا ہوں۔ وہ دوسری طرف منہ کئے کاغذ پر نظریں جمائے بیٹھی تھی۔ دروازے کی آہٹ پر اس نے کاغذ کو دوسری طرف رکھ دیا۔ ایک لمحہ کیلئے اس کے چہرہ پر بیزاری کے آثار ہویدا ہوئے لیکن مجھے دیکھتے ہی مسکرا کر وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔ میں سوٹ پہنے ہوئے تھا دری پر نہ بیٹھا۔ وہ بھاگ کر کرسی اٹھا لائی۔

"شکریہ" میں کرسی پر بیٹھ گیا۔

وہ مسکرا دی۔

میں نے ادھر ادھر نگاہ دوڑائی۔ ہر دیوار پر دو ایک تصویریں لٹک رہی تھیں۔ میں نے پوچھا۔

"یہ سب تمھاری بنائی ہوئی ہیں رادھا؟"

"تمھاری!" اس نے سر کو دلربایانہ انداز سے جنبش دیتے ہوئے کہا، اور مسکرا دی۔ میں بھی مسکراہٹ نہ روک سکا۔ اس کی آنکھوں میں ایک عجیب قسم کی چمک پیدا ہوگئی۔

"اب کیا کر رہی تھیں؟" میں نے پوچھا۔

"تصویر بنا رہی تھی۔"

"مجھے بھی دکھاؤ۔"

"نمائش میں دیکھنا۔"

"کونسی نمائش؟"

"انٹر ورسٹی۔"

"تو یوں کہو آپ کے "انٹر ورسٹی نمائش" میں اوّل رہنے کے ارادے ہیں!"

اس کا چہرہ اتر گیا۔ لمبا سانس لیتے ہوئے اس نے کہا: "ایسے بھاگ کہاں۔"

میں ہنسا۔ تصاویر کو ایک نظر دیکھ کر میں نے اٹھتے ہوئے کہا: "میں شرط لگاتا ہوں تم اوّل رہو گی۔ تم سے کوئی نہ جیت سکے گا۔"

"اور لال چند؟"

"اس کی کیا بساط ہے!"

"غلط!" اس نے کہا: "لال چند کے مقابلہ میں بازی لے جانا ٹیڑھی کھیر ہے۔ اگر اس نے بھی مقابلہ میں حصہ لیا تو میں جیت نہ سکوں گی۔"

میں نے وثوق کے ساتھ کہا: "نہیں، تم ہی جیتو گی۔ لال چند نے ان میں سے ایک بھی تصویر نہیں دیکھی ورنہ وہ مصوری کا خیال ہی چھوڑ دیتا۔"

"رہنے بھی دو! میری تعریف سے تمہیں کیا مل جائیگا۔"

میں کہنا چاہتا تھا "بہت کچھ" لیکن کہہ نہ سکا۔ میرا دھیان دیوار پر ٹنگی ہوئی ایک تصویر نے کھینچ لیا۔ واہ کیا چیز تھی۔ اسی کے ہاتھ سے بنی ہوئی اس کی اپنی تصویر۔

میں نے اسے دیکھتے ہوئے کہا: "رادھا!"

"ہاں۔"

"یہ مجھے دے دو"

اس نے تصویر کا رُخ دیوار کی طرف کر دیا اور ہنستی ہوئی بولی "تمہیں نہیں مل سکتی"

"نہیں مل سکتی"

اس نے ذرا سنجیدہ ہو کر کہا "نہیں مل سکتی"

میں نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر پھر پوچھا "نہیں مل سکتی؟"

اور سنجیدگی سے اس نے جواب دیا "بیس دفعہ کہتی ہوں نہیں مل سکتی۔ نہیں مل سکتی۔ نہیں مل سکتی"

میرا دل جل سا اٹھا۔ میں اس کی ہر چیز کو اپنی چیز سمجھتا تھا۔ میں تو شاید پوچھتا بھی نہ اور تصویر اٹھا کر لے جاتا۔ لیکن اچھا ہوا پوچھ لیا۔ سب بھرم کھل گیا۔ معلوم ہو گیا میں جنت الحمقا میں بستا ہوں۔ اس کی نظروں میں میری کچھ وقعت نہیں۔ تین سال سے ہم اکٹھے پڑھتے تھے۔ میں قریباً روزانہ ان کے ہاں جاتا تھا۔ وہ بھی کبھی کبھی ہمارے یہاں آ جاتی تھی۔ تین سال سے بنتے ہوئے تصورات کے محل دم بھر میں مسمار ہو گئے۔ میں نے ایک دفعہ پھر اس کے چہرے کی طرف دیکھا اور منہ پھیر کر کمرے سے نکل آیا۔ شاید وہ میرے پیچھے بھاگی۔ شاید اس نے مجھے آواز دی لیکن میں نے پیچھے مڑ کر نہیں دیکھا۔ قدم بڑھاتا چلا آیا۔

میں نے عہد کر لیا ہے اب اس کی طرف نہ جاؤں گا۔ تماشوں میں بھی حصہ نہ لوں گا۔ اسے معلوم ہو جائیگا کہ اس کے بغیر بھی جی سکتا ہوں، پڑھ سکتا ہوں اور سب کچھ کر سکتا ہوں۔

رادھا رانی

یہ بے چینی کیوں؟ اگر کمل نے میرے جذبات کا احترام نہیں کیا۔ اگر اس نے میری

تصویر واپس کر دی تو کیا ہوا؟ معمولی بات ہے ــــ لیکن نہیں یہ معمولی بات نہیں اس نے میری توہین کی۔ اگر میں نے ہنسی مذاق میں اسے تصویر نہ دی تو اسے ناراض نہ ہونا چاہیئے تھا۔ اور پھر میں نے اس غلطی کا کفارہ کر دیا۔ تصویر کو اپنے نوکر کے ہاتھ بھجوا دیا۔ اس نے تصویر واپس کر دی۔ غرور کی حد ہو گئی۔ اس نے سمجھا رادھا مجھے منانے آئے گی ــــ رادھا بمل کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتی۔ وہ پاگل ہو جائیگی۔ دیوانی ہو جائے گی۔ اس کا یہ خیال غلط ہے۔ رادھا بمل کے بغیر بھی زندہ رہ سکتی ہے۔ وہ پھر بھی اپنی سرگرمیوں کو اسی طرح جاری رکھ سکتی ہے۔ وہ خودکشی نہ کرے گی۔ زہر نہ کھائے گی۔ لیکن یہ بے چینی کیوں؟ سکون کا بند ٹوٹ گیا ہے؟ جذبات کے سمندر میں تلاطم کیوں برپا ہے؟

میں اسے منانے نہیں جاؤں گی۔ ہرگز ہرگز نہیں جاؤں گی۔ میں تصاویر بناؤں گی اور دل کی بے چینی کو ان میں گم کر دوں گی ــــــــ لیکن کیا ایسا کرنے سے میں لال چند کو جیت سکوں گی؟

اس کے شاہکاروں کو دیکھ کر اب تصویر بنانا ہی بے سود ہے۔ کتنا ہنرمند شخص ہے اور پھر کتنا خلیق اور حلیم الطبع ہے۔ اس دن جب میں منی موہن کی دکان پر کچھ سامان خریدنے گئی تھی تو وہیں وہ بھی تھا۔ مجھے دیکھا تو ہاتھ جوڑ کر نمستے کی اور ایک طرف ہٹ کر کھڑا ہو گیا۔

جاتے وقت میں نے پوچھا "کہو لال چند کیا شغل ہے آج کل؟"

میری بات میں طنز تھا۔ اس نے اس طرف توجہ نہیں دی اور خاموشی سے مجھے ایک تصویر تھما دی اور چلا گیا۔ دیر تک میں مبہوت و ساکن کھڑی رہی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ لال چند ایک بڑا بھاری پہاڑ ہے۔ میں اس کے مقابلہ میں حقیر رائی کا دانہ۔ یا وہ ایک بحرِ بیکراں ہے اور میں ایک چھوٹی سی ندی۔

کمرے میں جدھر نظر جاتی مصوری کے بیش بہا نمونے دکھائی دیتے۔ تصاویر میں جان نہیں تھی لیکن وہ جان دار معلوم ہوتی تھیں۔ ان کے زبان نہیں تھی لیکن زبان حال سے باتیں کر رہی تھیں۔

ایک چوکھٹے کی پشت ہماری طرف تھی۔ میں نے بڑھ کر اسے اٹھاتے ہوئے کہا:۔
"یہ کس کی تصویر ہے؟"

لال چند کی نگاہیں زمین میں گڑ گئیں۔

یہ میری تصویر تھی میں نے غصہ سے کہا: "لال چند اس تصویر کو بنانے سے مطلب؟" وہ خاموش رہا۔ پھر آہستہ سے بولا: "یہ تصاویر کالج کے زمانہ کی یادیں رادھا۔ میں نے اور بھی دوستوں کی تصویریں بنائی ہیں۔ یہ بھی بنالی"

"لیکن ہم تم میں تو دوستی نہ تھی!"

اس نے ایک دفعہ مایوس نگاہوں سے میری طرف دیکھا اور پھر نگاہیں جھکا لیں جیسے اسے افسوس تھا وہ شرمندہ تھا۔ اسے رنج تھا۔

میں نے وہ تصویر لے لی اور گھر چلی آئی۔ گھر آکر بیس روپے کا نوٹ ملازم کے ہاتھ بھیجا۔ لیکن لال چند نے اسے واپس کر دیا اور لکھا: "اس کی قیمت کون ادا کر سکتا ہے؟"

اس جواب میں کیا راز ہے۔ کیا وہ مجھ سے محبت کرتا ہے۔ کیا میری تصویر اس کے لئے بے بہا ہو سکتی ہے۔ لیکن نہیں وہ مجھ سے محبت نہیں کر سکتا۔ مجھ سے ——— جو ہمیشہ اسے نفرت کی نگاہ سے دیکھتی رہی جس کا ہمیشہ وہ مخالف رہا۔ لیکن پھر اس نے میری تصویر بنائی ہی کیوں؟ اور اگر بنائی تھی تو یہ جواب کیوں لکھا؟ دونوں تصویریں میرے سامنے ہیں۔ بمل نے اس تصویر کی تعریف کی تھی، وہ اسے لے جانا چاہتا تھا۔ اگر وہ یہ تصویر دیکھ لیتا تو اسے چھونا بھی پسند نہ کرتا۔ میں اپنی تصویر اتنی اچھی نہ بنا سکی جتنی

لال چند نے بنائی ہے۔ ایک نقلی رادھا معلوم ہوتی ہے دوسری اصلی۔ اگر بمل نے اب تصویر لینے کی خواہش ظاہر کی تو اسے یہی تصویر دوں گی ——— لیکن بمل اگر وہ ہزار دفعہ بھی مانگے تو اسے نہ دوں۔ دونوں تصاویر میرے ڈرائنگ روم کی زینت بنیں گی۔ مگر میں یہ تصویر نہ لوں گی۔ میں لال چند سے کوئی چیز بلا قیمت نہیں لینا چاہتی۔ میں ایک بار پھر روپئے اور تصویر بھیجوں گی۔ میں یہ تصویر چاہتی ہوں لیکن بلا قیمت نہیں۔ دونوں میں سے ایک چیز رکھ لو۔ روپئے یا تصویر!

لال چند

رادھا میرے تصویر خانہ میں آئی۔ دل کی تاریک دُنیا روشن ہو گئی۔ بے جان تصاویر میں ایک جان دار تصویر آکھڑی ہوئی۔ شعریت اور موسیقی کی ایک دُنیا میرے اس چھوٹے سے کمرے میں کھنچ آئی۔

وہ مجھ سے تصویر چھین کر لے گئی۔ اسے اچھی لگی یا اس نے مجھے اس سے محروم کرنے کی ٹھانی، کون جانے؟ لیکن رادھا کی تصویر کے بغیر تصویر خانہ ہی کیا؟ یہ تصویر بھی کیا خوب بنی ہے۔ میں نے اس دن کا نظارہ کھینچ کر رکھ دیا ہے۔ یہ وہ کھڑی ہے اور یہ میں۔ اس کے ہاتھ میں اس کی تصویر ہے اور میرا سر ندامت سے جھک گیا ہے۔ اسے نمائش میں بھیج دوں۔ اس کا عنوان رکھ دوں "پشیمانی"! لیکن نہیں وہ ناراض ہو جائے گی' اسے نمائش میں نہیں بھیجوں گا۔ کوئی اور تصویر کھینچ دوں گا۔ اپنے نام سے نہیں، اس کے نام سے۔ اس کے مقابلہ میں تصویر بھیجوں یہ مجھ سے نہ ہوگا۔ پجاری دیوتا کا مقابلہ کرے! یہ کیسے ہو سکتا ہے؟

اس نے تصویر واپس کر دی۔ اس نے کہا "میں اسے قیمت ادا کئے بلا نہیں لوں گی"، وہ کیا جانے، وہ قیمت ادا کر چکی ہے۔ اسے کیا خبر قیمت چاندی کے چند ٹکڑوں

ہی کا نام نہیں۔ اس کا ایک دفعہ میرے تصویر خانہ میں قدم رکھنا ہی مجھ کو خرید کر لے جاتا تھا۔ میں نے بیس روپئے رکھ لئے۔ میں اس کو ناراض نہ کرنا چاہتا تھا۔

اس نے لکھا۔ میں یہ احسان تمام عمر نہ بھولوں گی۔ وہ یہ تصویر ضرور کپل کو پیش کرے گی۔ مجھ سے میری روح چھین کر دوسرے کے قالب میں ڈالے گی۔ لیکن خواہ وہ تصویر کپل کو دے یا خود رکھے کم از کم اس نے میری تصویر کی تعریف تو کی۔ اس نے یہ تو کہا۔ میں تمہارے آرٹ کی قائل ہوں۔ آخر اسے معلوم تو ہو گیا کہ لال چند کچھ یوں ہی نہیں وہ بھی کچھ ہنر رکھتا ہے۔ اگر کپل ایم۔ اے بھی ہو گیا تو کیا ہو گا۔ اسے کون پوچھے گا۔ اس کے برعکس میری تصویروں کی دھوم سارے ملک میں مچ رہی ہے۔ رادھا نے بھی مان لیا کہ ان میں سحر ہے۔ لیکن کون ہے جو مجھ سے اس قدر اچھی تصاویر بنوا لیتا ہے۔ کون ہے جو میرے ہاتھوں میں اعجاز بھر دیتا ہے؟ تم ہی تو ہو رادھا تمہارا ہی تصور اس پردہ میں کارفرما ہے۔ اگر تم نہ ہو تو کیا لال چند ایسی اچھی تصاویر بنا سکے۔ کیا وہ اس قدر مقبول ہو؟ ہرگز نہیں۔ تم پر اپنی قابلیت کا سکہ بٹھلانے کا خیال ہی تو تھا جس نے اسے مصوری کیلئے آمادہ کیا۔ ورنہ اس وقت لال چند کپارٹمنٹ کی تیاری میں ہوتا۔ نہ تمہارا تصور چھوڑ سکتا نہ مطالعہ میں جی لگا سکتا۔

کس شان سے تصویر لئے کھڑی ہے۔ گویا ابھی میرے سر پر دے مارے گی۔ اور میں ندامت سے کتنا جھک گیا ہوں۔ یہ تصویر نمائش میں بھیج دوں چل ہی تو جائے۔ لیکن یہ تصویر نمائشوں کیلئے نہیں۔ یہ تو کاشانۂ دل ہی کی زینت بنے گی۔ نمائشوں سے اسے کیا غرض!

رادھا رانی

نمائش ہوئی۔ دوسری یونیورسٹیوں کے طلباء نے بھی اپنے شاہکار بھیجے۔ ٹکٹ

زیادہ ہونے کے باوجود بھی شائقین کافی تعداد میں جا رہے تھے۔ طلبا کے علاوہ دوسرے لوگ بھی نمائش کی تعریف سن کر ٹوٹے پڑتے تھے۔ سنتی تو جی مسوس کر رہ جاتی۔ میں نمائش نہ گئی۔ میں نے اپنی تصویر بھی نہ بھیجی۔

دوپہر ڈھل چکی تھی۔ چار بجے کا عمل ہوگا۔ کھڑکی کی جالی سے آنے والی دھوپ قریباً جا چکی تھی۔ میں اپنے تصویر خانہ میں اداس سی بیٹھی تھی۔ سامنے دونوں تصویریں ٹنگی ہوئی تھیں۔ میں نے دونوں کا موازنہ کیا۔ کہاں لال چند کی بنی ہوئی تصویر اور کہاں میری۔ دونوں میں زمین آسمان کا فرق تھا۔ میں نے اچھا ہی کیا جو اپنی کوئی تصویر نہ بھیجی۔ لال چند کے مقابلہ میں تصویر بھیجتی تو مایوسی کے سوا ہاتھ کیا لگتا۔ دل میں جلن الگ رہ جاتی۔

دروازہ زور سے کھلا اور بمل داخل ہوا۔ خوشی سے اس کا چہرہ شرخ ہو رہا تھا۔ اس نے آتے ہی میرے کندھوں کو تھپتھپاتے ہوئے کہا:۔

"مبارک ہو رادھا! تمھاری تصویر نمائش میں اول رہی!"

"میری؟"

"ہاں صبح اعلان ہوا تھا۔ تم وہاں گئیں کیوں نہیں؟ وہاں انعام تقسیم ہونے والے ہیں۔ تمھارا انتظار ہو رہا ہے۔ چلو پرنسپل صاحب بلا رہے ہیں۔"

ایک لمحہ کیلئے میں مبہوت سی کھڑی رہی۔ میری تصویر اوّل نمبر پر آئی۔ کچھ سمجھ میں نہیں آتا تھا۔ میں نے بمل کے چہرے کی طرف دیکھا۔ وہ بالکل سنجیدہ تھا۔ بولا:۔

"یوں کیا دیکھ رہی ہو۔ میں تمھیں بلانے آیا ہوں۔"

"لیکن میں نے تو کوئی تصویر بھیجی ہی نہیں۔" میں نے جواب دیا۔

"اب ان نخروں کو رہنے دو۔" اور وہ مجھے کھینچتا ہوا باہر لے آیا۔ ہم موٹر میں سوار ہو کر نمائش میں پہنچے۔ وہاں جلسہ ہو رہا تھا۔ تقسیم انعامات کی کارروائی شروع

ہونے والی تھی۔ میرے وہاں پہنچتے ہی طلبا نے تالیاں بجائیں۔ پروفیسر اور خود پرنسپل صاحب نے مجھے مبارکباد دی "تم نے پنجاب کا نام رکھ لیا۔ تم نے ثابت کر دیا کہ آرٹ میں بھی پنجاب کسی صوبہ سے پیچھے نہیں۔ واہ کیا تصویر بنائی ہے۔ نقوش میں جان ڈال دی"

لیکن میرے لئے یہ سب جملے بے معنی تھے۔ اس شخص کی طرح جسے زبردستی تخت پر بٹھا دیا جائے۔ میں سب کچھ دیکھ رہی تھی سن رہی تھی۔ پرنسپل صاحب نے میری تصویر کے متعلق ایک مختصر سی تقریر کی اور مجھے پچاس روپے کی تھیلی اور ایک سونے کا میڈل عطا کیا گیا۔

اس تمام عرصے میں لوگوں کی نگاہوں کا مرکز بنی رہی۔ جب اپنی جگہ آ کر بیٹھی تو میرا دل دھڑک رہا تھا۔ اس سے پہلے میری سمجھ میں نہیں آیا تھا کونسی تصویر ہے جس پر مجھے انعام ملا۔

جلسہ ختم ہوتے ہی میں کمل کا بازو تھام کر دور لے گئی۔ میں نے کہا "کمل ذرا وہ تصویر تو دکھاؤ جس پر مجھے انعام ملا ہے؟"

"تمہیں دکھاؤں؟" اس نے طنز سے کہا "وہی تصویر جو تم اس دن مجھے دکھا رہی تھیں نا!"

"لیکن وہ تو میں نے نمائش میں نہیں بھیجی تھی"

"اور نہیں تو تمہاری جگہ فرشتوں نے بھیج دی۔ چلو اب پتا جی کو جا کر یہ خوشخبری سنائیں"

"میں تو سب تصویریں دیکھ کر جاؤں گی۔ میں نے نمائش دیکھی ہی نہیں" میں نے اصرار سے کہا۔

وہ آگے آگے ہو لیا۔ میں پیچھے پیچھے چلی۔ ہم دونوں تصاویر کی گیلریوں سے گزرتے

لگے۔ فن کے ایسے اچھے اچھے نمونے موجود تھے کہ ایک ایک کے سامنے گھنٹوں کھڑے رہنے کو جی چاہتا تھا۔ ایک سے ایک تصویر بڑھ چڑھ کر تھی۔

ایک جگہ نرمل رک گیا۔

"رادھا! جی چاہتا ہے وہ ہاتھ چوم لوں جنھوں نے یہ تصویر بنائی ہے۔ تم نے اتنی اچھی تصویر بنانا سیکھ کہاں سے لیا!"

میں نے دیکھا مصوری کا بے حد اچھا نمونہ تھا۔ ایک مصور تصویر بناتا بناتا بھول گیا اور دماغ میں اپنی محبوبہ کا نقشہ کھینچ رہا تھا۔ اس کی آنکھوں کے سامنے اس کا سایہ کھڑا تھا۔ لیکن یہ تصویر میری نہیں تھی لال چند کی تھی۔ یہ اسی کی تصویر تھی۔ پھر میں کیوں تمغہ لوں؟ کیوں انعام رکھوں۔ کسی کی محنت کا فائدہ میں کیوں اٹھاؤں؟

نرمل سے جدا ہوتے ہی میں سب سے پہلے لال چند کے تصویر خانہ میں گئی۔ وہ ایک تصویر بنانے میں منہمک تھا۔ مجھے دیکھتے ہی اس نے تصویر کو چھپا دیا۔ میں نے جاتے ہی کہا "لال چند!"

وہ خاموش رہا۔

"تم نے میرے نام پر تصویر کیوں بھیجی؟"

"میں نے؟" مسکراتے ہوئے اس نے پوچھا۔

"اور کس نے؟" میں نے ذرا غصے سے کہا "میں ہزاروں میں تمھاری تصویر پہچان لوں لال چند!"

وہ صرف میری طرف دیکھتا رہا۔

ایک لمحہ کیلئے میرے جسم میں سنسنی سی پیدا ہوئی۔ میں نے جیب سے سنہری میڈل کی ڈبیا نکالی۔

"لال چند، دیکھو اگر اس وقت تم نے میرا کہا نہ مانا تو مجھے تمام عمر رنج رہے گا۔"

کہہ کر میں نے ڈبیا سے میڈل نکال کر اس کے کرتے میں ٹانک دیا اور پچاس روپئے کی تھیلی اس کے سامنے رکھ دی۔

"یہ اس پر انعام ملا ہے"۔ ایک لمحہ کیلئے ہماری نگاہیں چار ہوئیں۔ میں وہاں ٹھہر نہ سکی چلی آئی۔

بمل کشور

رادھا کی پس و پیش کے باوجود ہمارے والدین نے ہمیں شادی کے رشتے میں منسلک کر دیا۔ میں نے اب اور زیادہ انتظار کرنا فضول سمجھا۔ تعلیم تو ہمارے لئے شغل کا سامان تھی۔ ہمیں ملازمت کی اتنی پرواہ نہ تھی۔ اور مجھے شبہ تھا شاید پھر میں اسے حاصل نہ کر سکوں اس نے 'نہ نہ' بھی کی۔ لیکن اس کے تامل کو والدین نے اس کی نسوانی حیا پر محمول کیا۔

ان دنوں نہ جانے رادھا کو کیا ہو گیا تھا۔ اسے شادی کے نام سے چڑ ہو گئی تھی۔ انکار پر انکار کرنے لگی۔ میں گھبرا گیا۔ لیکن خیر یہ گذری کہ کسی نے اس سے سبب پوچھنا مناسب نہ سمجھا۔ اور اپنے والد کے سامنے آنے کا حوصلہ اسے نہ ہوا۔ انھیں ہماری محبت کا علم تھا۔ اس لئے انھوں نے اس سے زیادہ استفسار نہ کیا۔

وہ دن میں نے دوستوں کی محفل میں گذارا۔ سارا دن رنگ رلیاں ہوتی رہیں۔ مبارکبادیوں کا تانتا لگا رہا۔ میں چاہتا تھا کسی طرح چھٹی ملے تو رادھا سے دو باتیں کر لوں لیکن دوست کب چھوڑتے تھے۔ ان کا خیال تھا شادی کے بعد دوست دوست نہیں رہتا، میں نے اصرار کیا تو کہنے لگے۔ آج تو جی بھر کر باتیں کرنے دو۔ پھر درشن بھی نصیب نہ ہونگے۔ میں ہنسا۔ ان کی دانست میں شادی ہونے سے میں کچھ بدل گیا تھا۔

شام کے وقت دوستوں سے رخصت ہو کر میں اندر جانے کو تھا کہ کسی نے مجھے تصویر اور ایک رقعہ دیا۔ رقعہ رادھا کیلئے تھا۔ میں اس کے کمرے میں داخل ہوا۔ وہ ایک آرام

کرسی پر خاموش بیٹھی ہوئی تھی۔ آنکھیں قریباً بند تھیں لیکن سوئی ہوئی نہ تھی۔ شاید کسی خیال میں مستغرق تھی۔ میں نے تصویر اس کی گود میں رکھ دی۔ وہ چونک پڑی۔

"لال چند نے تمہاری شادی پر تمہیں تحفہ بھیجا ہے۔" اور میں نے رقعہ اس کی گود میں پھینک دیا۔

اس نے رقعہ کو نظر انداز کر دیا۔ تصویر کو دیکھنے لگی۔ اس کی آنکھوں میں ایک چمک سا پیدا ہوئی اور فرطِ جوش سے اس نے تصویر کو چوم لیا۔ اس کے منہ سے ایک سرد آہ نکلی اور پھر اس کا چہرہ زرد پڑ گیا۔

"اس کے ہاتھوں میں جادو ہے۔" اس نے آہستہ سے کہا اور پھر میری طرف دیکھ کر چپ ہو گئی۔ کچھ دیر بعد آہستہ آہستہ جیسے اپنے آپ سے باتیں کر رہی ہو۔ اس نے کہا "جی چاہتا ہے اسی جوڑے میں ہم بھی اس سے تصویر کھنچوائیں۔"

میں چپ کھڑا رہا۔ اچانک وہ مڑی۔ اور اٹھ کر اس نے میرے کندھے پر ہاتھ رکھ کر کہا "سہیل!"

"ہاں!"

"میں تمہارے ساتھ اسی لباس میں اسی عروسی جوڑے میں لال چند سے تصویر کھنچوانا چاہتی ہوں۔ کہو چلو گے؟"

میرے دل پر ایک ہلکا سا بادل ایک لمحہ کیلئے آیا اور چلا گیا۔ ان دنوں وہ کچھ اداس سی رہا کرتی تھی۔ اور میں اس کی ہر خواہش کو پورا کرنے کا فیصلہ کر چکا تھا۔ ایک لمحہ کیلئے ہماری آنکھیں چار ہوئیں۔ اس کی آنکھوں میں التجا تھی۔ میں نے اسے مایوس کرنا مناسب نہ سمجھا۔ بولا "چلو"

باہر نکل کر میں نے شوفر کو آواز دی۔ وہ بولی "میں موٹر پر نہ جاؤں گی"

ہم پیدل ہی چل پڑے۔ آسمان بادلوں سے گھرا ہوا تھا۔ وحشت خیز ہوا چل رہی

تھی۔ پتہ پتہ جھوم رہا تھا۔ لیکن ہم دونوں چپ چاپ چلے جا رہے تھے۔ میں نے ایک دو بار گفتگو کرنے کی کوشش بھی کی لیکن اس کی بے رخی نے میرا حوصلہ پست کر دیا۔ مجھے اس کی خاموشی پر افسوس ہوا۔ اس قسم کا موسم اور ایسی خاموشی! ایسے موسم میں تو گانے کو، شور مچانے کو۔ ایک دوسرے سے لپٹ جانے کو جی چاہتا ہے۔ لیکن ہم دونوں چپ تھے۔ جا رہے تھے۔ الگ الگ اپنے خیال میں مست!

دوکان آ گئی۔ میں نے پوچھا "مسٹر لال چند اندر ہیں؟"

"وہ دوکان چھوڑ گئے ہیں"

"دوکان چھوڑ گئے ہیں" رادھا نے بیتابی سے پوچھا۔

"جی ہاں"

"اور تصاویر؟"

"انھیں جلا دیا گیا ہے"

رادھا نے ایک سرد آہ بھری اور آخری امید کا سہارا لیتے ہوئے کہا "اب کہاں ملیں گے؟"

"کمپارٹمنٹ کی تیاری کرنے گاؤں کو چلے گئے ہیں"

تین سو بیس

موٹریں اڈے پر آکر رکیں۔ قلیوں کی دنیا میں ہل چل مچ گئی۔ بیٹھے کھڑے ہو گئے کھڑے دوڑ پڑے جیسے سونے کی برکھا ہوئی ہو، کوئی آسمانی نعمت ان کے درمیان آ گری ہو۔ پل کے پل میں میلے، پھٹے، بوسیدہ کپڑے پہنے بیسیوں قلی موٹر کو گھیر کر کھڑے ہو گئے۔ اکثر نے اپنے پیتل کے نمبر بھی موٹر میں پھینک دیئے۔

موٹر میں بیٹھے ہوئے مسٹر والٹن اور ان کا کنبہ پیتل کے ٹکڑوں کی اس بارش سے گھبرا اٹھا اور دوسرے لمحے مس والٹن تُنک کر موٹر میں کھڑی ہو گئی۔ اس کی جوان آنکھوں میں غصے کے ڈورے دوڑ گئے۔ چہرہ تمتما اٹھا۔ اس نے سب نمبروں کو اٹھایا اور قلیوں کے منہ پر دے مارا۔ ایک پیتل کا نمبر والٹن صاحب کی گود میں پڑا تھا۔ اُسے اٹھاتے ہوئے مس والٹن نے جونہی پھینکنے کی کوشش کی ایک خوشنُما ادر

وجیہ قلی دوسروں کو ہٹاتے ہوتے مس والٹن کے سامنے آکھڑا ہوا۔ کچھ بے پرواسا کچھ اکھڑا اکھڑا سا، کچھ مغموم سا۔ حسینہ کی غضب ناک آنکھیں قلی کی حسرت بھری آنکھوں سے چار ہوئیں۔ اس نے نمبر نہیں پھینکا اور اپنی جگہ چپ چاپ بیٹھ گئی۔ قلی اور نزدیک آکر موٹر کے پاس کھڑا ہو گیا۔ صاحب اپنی بیوی کو ساتھ لیکر دوسرے دروازے سے اتر گئے۔

مس والٹن نے سر سے پاؤں تک قلی کو دیکھا۔ اور پھر دور تک نگاہ دوڑائی۔ ان جلبیھڑوں میں لپٹے، نیم برہنہ ٹانگوں اور ننگے بازوؤں والے وحشی صفت قلیوں میں جو پاؤں میں سیر ڈیڑھ سیر کی چپل پہنے ہوئے تھے جن کے گھٹنوں تک میل کی تہیں چڑھی تھیں۔ جن کے چہروں پر حسرت اور غریبی برستی تھی اور جن کی آنکھوں کے پپوٹے گرد سے سیاہ ہو گئے تھے۔ کون اس جیسا بہادر کون اس جیسا دلیر، کون اس جیسا خوبصورت تھا۔ اس نے دیکھا نوجوان قلی کے گورے گورے بازوؤں پر محنت اور مشقت کی وجہ سے مچھلیاں پڑ گئی ہیں۔ اور ان میں نیلی نیلی رگیں ابھر آئی ہیں۔ اس کے سر پر ٹوپی نہیں تھی۔ گلے میں کرتا تھا لیکن آستین اور گریبان کی قید سے آزاد!

"تمہارا نام؟"

"۳۲۴"

"نمبر نہیں، نام!"

"حیدر"

"حیدر!" اور پھر پوچھا۔

"کتنا بوجھ اٹھا سکتا ہے؟"

"بہت کافی مس صاحب!"

ڈرائیور نے دروازہ کھولا مس والٹن کھٹ کھٹ نیچے اتر گئی۔

"وہ پیانو اٹھا لے سکتا؟" اس نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔

حیدر نے اس طرف نگاہ دوڑائی اور پھر چہرے سے بالوں کی خشک لٹوں کو پرے ہٹایا۔ ٹرک[1] میں ایک بڑا سا پیانو رکھا تھا۔ اور چار پانچ قلی اسے نیچے اتارنے کی کوشش میں مصروف تھے۔

اس نے جواب دیا "ہاں اٹھا لوں گا"

یہ جواب دیتے ہوئے اسے پیانو کے وزن کا دھیان آیا۔ لیکن ساتھ ہی اس کی آنکھوں کے سامنے اپنے گھر کی بے بسی کی تصویر کھنچ گئی۔ اور پھر اسے اپنے قول کا بھی خیال آیا۔ جب ہاں کہہ دی پھر نہ کیسی؟ کیا انکار کر کے اب اس ماہ جبیں کی نظروں میں کمزور بننا اسے منظور ہوگا۔ نہیں۔ اور وہ آگے بڑھا۔

سُریلے گیت گانے والا پیانو، جس کیلئے مس والٹن ایک علیحدہ کمرہ ریزرو رکھا کرتی تھی اتار کر زمین پر رکھ دیا گیا۔ اور دو تین ہانتو[2] اسے اٹھانے کے لئے تیار ہوئے۔

"اسے یہ قلی اٹھائے گا" مس والٹن نے آگے بڑھ کر کہا۔

صاحب نے حیدر پر سر سے پاؤں تک ایک نظر ڈالی اور حیرت سے بولے:۔

"اکیلا؟"

"ہاں!" اور مسکراتے ہوئے حیدر کی طرف دیکھ کر مس والٹن بولی "کیوں اٹھائے گا اکیلا؟ ہم انعام بھی دے گا"

حیدر کا سینہ پھول اٹھا۔ اس نے کہا "ہاں مس صاحب"

"تین مائل جائیگا"

"لے جاؤں گا"

---

[1] اسباب اٹھانے والی موٹر۔ [2] کشمیر اور ناہن کے قلیوں کو ہانتو کہتے ہیں۔

"ہم تمہیں بہوت اینام دے گا"، اور مس والٹن کی مشتاق نگاہیں اس قلی پر جم گئیں۔ دیکھتے دیکھتے حیدر نے پیانو کے گرد رسّہ لپیٹ لیا۔ جو ہاتو اسے اٹھانے کیلئے آگے بڑھے تھے پیچھے ہٹ گئے۔ دو آدمیوں کی مدد سے حیدر نے پیانو پیٹھ پر لاد لیا۔ اس کی کمر دوہری ہو گئی۔ پیشانی پر پسینہ آگیا۔ اپنی چھوٹی سی لٹھیا کے سہارے وہ چل پڑا۔

"مر جائے گا سُسرا"، ایک ہاتو نے کہا۔

پوں پوں کرتی ہوئی دوسری موٹر گاڑی آکھڑی ہوئی۔ اور سب اس کی طرف دوڑ پڑے۔

مس والٹن وہاں کھڑی کی کھڑی رہ گئی۔ اتنا بڑا پیانو جسے چار آدمی مشکل سے اٹھا سکیں اس اکیلے حیدر نے اٹھا لیا۔ یہ یورپ میں ہوتا تو بوجھ اٹھانے کا ریکارڈ رکھ کر ہزاروں روپیہ کما لیتا۔ اس کے نوجوان دل میں اس قلی کے لئے ہمدردی کا سمندر موجزن ہوا اٹھا لیکن یہ ہمدردی اس کی حسرت بھری آنکھوں، اس کے معصوم چہرے، اس کے بوسیدہ لباس، اس کی لاچاری، اس کی بے بسی کو دیکھ کر پیدا نہیں ہوئی۔ وہ اُس فرقے سے تعلق رکھتی تھی جہاں یہ باتیں ہمدردی خریدنے کی بجائے نفرت مول لیتی ہیں۔ لیکن بہادر کے لئے، خوبصورت کے لئے اُنس پیدا ہو جانا بالکل قدرتی ہے اور پھر نوجوان عورت کے دل میں! ——— وہ دل چاہے کسی انگریز عورت کا ہو یا ہندوستانی نازنین کا۔

رکشا اس کے نزدیک آکر کھڑی ہو گئی۔ والٹن صاحب نے تین رکشاؤں کیلئے آرڈر دیا تھا۔ مس والٹن سب سے پہلی رکشا میں بیٹھ گئی۔ دوسری میں اس کی ماں۔ اور سب سے آخری رکشا میں صاحب خود بیٹھے۔ پانچ سات قلی دوسرا سامان اٹھا کر ساتھ ساتھ چلنے لگے۔

والٹن صاحب ریٹائرڈ انجنیر تھے۔ پنشن ملتی تھی۔ کُنبہ بھی بہت بڑا نہیں تھا۔

مزے سے بسر ہو رہی تھی۔ شملہ میں انھوں نے دو تین کوٹھیاں بنوالی تھیں۔ کرایہ بھی آ جاتا تھا۔ ان کی اپنی کوٹھی کا نام "کیمور کاٹیج" تھا۔ چھوٹے شملہ سے ذرا دور ایک دیدہ زیب جگہ پر بنی ہوئی تھی۔ کوٹھی کے سامنے باغیچہ تھا۔ فرصت کا وقت والٹن صاحب اس میں طرح طرح کے پودے لگانے میں صرف کرتے تھے۔ انھیں اس میں بڑا آنند ملتا تھا۔ کبھی کبھی ان کی لڑکی بھی اس کام میں ان کا ہاتھ بٹاتی۔ اسے اپنے نقش قدم پر چلتے دیکھ کر والٹن صاحب خوشی سے پھولے نہ سماتے۔ یوں تو ایک مالی بھی ملازم تھا لیکن اس کا کام زیادہ تر سردیوں میں باغیچے کی دیکھ بھال کرنا تھا۔ گرمیوں میں صاحب خود دلی سے آجاتے۔ تب ان کا کافی وقت اس باغیچے ہی میں گزرتا۔ مس والٹن کو پیانو بجانے میں کمال حاصل تھا۔ جہاں ایک دو مہینے کیلئے جانا ہوتا وہیں لے جاتی۔ یہ پیانو خاص طور پر اس نے ولایت سے منگایا تھا۔ عام پیانو سے کتنا بڑا۔ سُر ملا اتنا کہ جب مس والٹن کی ملاحت بار آواز اس کی آواز سے مل جاتی تو گویا سونے پر سہاگہ ہو جاتا۔ فضا کے ذرے ذرے میں ایک حیات آفریں نغمہ بس جاتا۔ سننے والے بُت بن جاتے اور انھیں ماضی یا مستقبل کی کوئی خبر نہ رہتی۔

حیدر سانس لینے کیلئے رکا۔ شملہ میں سڑکوں کے کنارے سیمنٹ کے چبوترے بنے ہوئے ہیں۔ تاکہ پیدل لوگ وہاں بوجھ رکھ کر سستا لیا کریں۔ مس والٹن اپنے خیالات میں کھوئی تھی۔ حیدر کو رکتے دیکھ کر کھلکھلا کے کود پڑی۔ صاحب اور ان کی بیوی اس سے بہت آگے نکل چکے تھے۔ اس نے حیدر سے کہا "کیوں تھک گیا۔ لو لاؤ ہم ٹرنک اٹھاؤ۔ تم تھک جائے گا۔ لیکن مانا نہیں"

حیدر سستائے بغیر چل پڑا۔ کسی حسینہ کے سامنے تھکنے کا نام لینا اور پھر بہادری کا دم بھرنا!

"شاباش!" مس والٹن اس کے ساتھ چلتے ہوئے بولی "اگر تم آرام کئے بِنا

اسے بنگلے تک لے گیا ٹو ہم ٹو بہوٹ اینام ڈے گا۔ جو مانگے گا وہ ڈے گا۔"

بائیں ہاتھ میں لٹھیا پکڑ کر اس کے سہارے اٹک کر سنبھلتے دائیں ہاتھ سے پیشانی کا پسینہ پونچھا اور چل پڑا۔ اس کے پاؤں من من بھر کے ہوئے جاتے تھے۔ اس کے ماتھے سے پسینہ بہہ رہا تھا۔ اس نے ابھی تک کبھی اتنا بوجھ نہیں اٹھایا تھا لیکن میم صاحبہ خوش ہو گئی تھیں۔ اگر وہ اس پیانو کو وہاں تک پہنچا دے گا تو ضرور ہی اسے دو تین روپئے انعام دے دیں گی۔ ہو سکتا ہے اسے اپنے ہاں نوکر ہی رکھ لیں۔ پھر تو اس کی زندگی بن جائے۔ وہ آمنہ کو سکھ دے سکے۔ اپنی اسی پیاری آمنہ کو جس نے اس کیلئے امیری سے غریبی مول لے لی تھی۔ اپنے متمول والدین کو چھوڑ کر عیش و عشرت پر لات مار کر اس کے ساتھ ہو لی تھی۔ جو اس سے محبت کرتی تھی۔ اسے سب یاد تھا ـــــ وہ دن جب لاہور میں اسٹیشن سے سامان اٹھا کر وہ ایک گلی کے بڑے سے مکان میں لے گیا تھا۔ اور جب برقعہ کو اٹھا کر حشر بپا کر دینے والی دو آنکھوں نے اس کی طرف دیکھا تھا۔ اسے یاد تھا کس طرح وہ آنکھیں اس پر مہربان ہو گئی تھیں۔ کس طرح آنکھوں ہی آنکھوں میں اسے محبت کا پیغام ملا تھا۔ کس طرح اس نے قلی کا کام چھوڑ کر اس گلی میں پان کی دکان کر لی تھی۔ کس طرح آمنہ اس کے ساتھ بھاگ کر آئی تھی۔ اور کس طرح اسے قید و بند کی مصیبتوں سے بچانے کے لئے اس نے کچہری عدالت میں اس کے ساتھ زندگی بسر کرنے کا عہد کر لیا تھا۔ سب یاد تھا۔ وہ دن، وہ راتیں، وہ گھڑیاں، وہ پل۔ محبت کے، پیار کے، صبر کے، سپنوں کے ـــــ کل کی بات کی طرح یاد تھے۔ وہ کماتا تھا آمنہ کو سکھ دینے کے لئے۔ ابھی اسے کچھ پرواہ نہ تھی۔ وہ سوچتا اگر میرے پاس کچھ روپیہ ہوتا۔ کچھ تھوڑا بہت ہی تو پھر آمنہ کو لے کر دور کسی چھوٹے سے قصبے میں ایک دکان کر لیتا۔ لیکن روپیہ آتا کہاں سے۔ آمنہ کو ساتھ بھاگنے سے اس کی رہی سہی پونجی بھی اڑ گئی تھی۔ اور مجبور ہو کر اسے پھر مزدور بننا پڑا

تھا۔ وہ دن میں دو روپے کما لیتا تھا۔ اس کے جسم میں طاقت تھی۔ بازوؤں میں قوت تھی کہ کشمیر اور ناہن کے ہاتو بھی اسے بوجھ اٹھاتے دیکھ کر دنگ رہ جاتے تھے۔ آمنہ کہتی "مجھے تمھارے ساتھ سوکھی روٹی پسند ہے۔ تم بہت تکلیف نہ کیا کرو" لیکن وہ اس کی باتوں پر کان نہ دھرتا تھا۔ اسے ایک ہی دھن تھی، ایک ہی لگن تھی۔ کچھ روپیہ پیدا کرنا اور بس! اس کے بعد وہ اس پیشے کو ہمیشہ کے لئے خیرباد کہہ دے گا۔

آمنہ اس کے کپڑے دھو دیتی تھی۔ جب وہ شام کو تھک کر آتا تو اس کے پاؤں دباتی۔ ہزاروں خرچ کرنے پر بھی ایسی نیک بخت بیوی نہ ملتی۔ لیکن وہ اسے پاکر بھی سکھی نہ تھا۔ جب وہ دیکھتا کہ آمنہ اس اندھیری سی کوٹھڑی میں سارا سارا دن بند رہنے سے زرد ہوئی جا رہی ہے تو اس کا دل خون کے آنسو روتا۔ وہ اسے شیش محلوں میں، سنگ مرمر کے عالی شان ایوانوں میں، بیش قیمت ریشمی لباس میں ملبوس دیکھنا چاہتا تھا۔ لیکن اس کے یہ ارمان اس طائر بے بال و پر کی حسرتوں کے مانند تھے جو پہاڑ کی چوٹی سے عمیق کھڈ میں گر پڑا ہو اور پھر اوپر پرواز کرنا چاہتا ہو۔

حیدر نے لمبا سا سانس لیا۔ اس کا سینہ درد کرنے لگا تھا۔ اسے معلوم تھا کہ اس وقت جب وہ بوجھ اٹھائے چلا جا رہا ہے آمنہ بھی کوئی نہ کوئی کام کرتی ہوگی۔ اس نے قالیچے بنانا سیکھا تھا۔ دونوں کچھ روپیہ اکٹھا کرنا چاہتے تھے جس سے وہ کوئی کام شروع کرسکیں۔ انھیں پوری امید تھی کہ اس سال کے خاتمہ پر ان کے پاس کوئی چھوٹا موٹا کاروبار کرنے کیلئے مناسب رقم جمع ہو جائیگی۔

حیدر سوچ رہا تھا ـــــ کون جانے یہ لڑکی اس سے خوش ہو کر اسے اپنے ہاں نوکر رکھ لے۔ اس صورت میں اس کی تمنا بہت جلد پوری ہو جائے گی۔ ابھی انھیں کمرے کا کرایہ بھی دینا پڑتا ہے۔ اور خرچ بھی بہت ہوتا ہے۔ پھر روٹی اور رہائش کا غم نہ رہے گا۔ تھوڑا بہت سرمایہ جمع کر لیں گے اور کسی چھوٹے سے قصبہ میں جا بسیں گے۔

وہ ہو اور آمنہ کی لازوال محبت اور بس۔ اسی طرح یہ زندگی کا ناٹک ختم ہو جائے۔

لیکن یہ پیانو وہاں پہنچ بھی سکے گا؟ اگر وہ سستا لیتا تو شاید پہنچا بھی دیتا لیکن بغیر سانس لئے تین میل! چڑھائی کے تین میل! بالکل ناممکن ہے۔ موٹروں کے اڈے سے سڑک پر آتے ہی اس کی جان قبض ہو گئی تھی۔ اس کی قوت اسے جواب دے رہی تھی۔ اس نے سوچا۔ پیانو کو رکھ دے۔ اسی وقت مس والٹن نے کہا "شاباش حیدر شاباش! اگر تم پیانو کو بنگلے تک لے گیا تو بہوت اینام دے گا"

حیدر کے مردہ جسم میں پھر جان پڑ گئی۔ امید نے پھر آب حیات کا کام دیا۔ اور وہ چل پڑا۔

مس والٹن رکشا کو چھوڑ کر اس کے ساتھ چل رہی تھی۔ تیرہ چودہ سال کا سن۔ نازک کمر، جسم کے ساتھ چپٹا ہوا فراک، سرو قد، اونچی ایڑی کے بوٹوں کی وجہ سے اٹھے ہوئے چھوٹے چھوٹے پاؤں۔ گورے گورے بازو تیکھے نقش ـــ اس طرح چلی جا رہی تھی گویا حیدر کو نہیں اس کو انعام جیتنا ہو۔ وہ سوچتی، اتنا بہادر بھی کہاں؟ یہ شخص جہاں بھی جائیگا انعام پائے گا۔ فوج میں بھرتی ہوتا تو اب تک کرنیل ہوتا۔ کرکٹ کی مشق کرتا تو اب تک کپتان بن جاتا۔ اتنا بوجھ! اسے اٹھانا ہی کار دارد والا معاملہ تھا۔ پھر اٹھا کر تین میل چلنا۔ اس نے حیدر کو محبت بھری نگاہ سے دیکھا۔ وہ اسے اپنا سب کچھ دے دے۔ اس بہادر قلی پر نثار ہونے کے لئے اس کا نوجوان دل بیتاب ہو اٹھا۔

ایک صاحب تھے مسٹر براؤن مس والٹن کی محبت کا دم بھرتے تھے۔ اسے خیال آیا کہ اگر ان کو یہ پیانو اٹھانا پڑے تو کچومر ہی نکل جائے۔ اس خیال کے آتے ہی اس کے سرخ ہونٹوں پر مسکراہٹ دوڑ گئی۔

"شاباش حیدر!" اس نے حیدر کو رکتے ہوئے دیکھ کر کہا۔ اور پھر اپنے خیالات میں

محو ہو گئی۔ کبھی کبھی کوئی مسافر حیدر کو اتنا بوجھ اٹھائے اور اس انگریز حسینہ کو اس کے ساتھ اس طرح جاتے دیکھ کر حیرت سے ایک لمحہ کے لئے کھڑا ہو جاتا اور پھر اپنی راہ چلا جاتا۔

چھوٹے شملہ کا ڈاک خانہ آگیا تھا۔ حیدر کو ٹانگیں جواب دیتی ہوئی معلوم ہوئیں اسے اپنے حواس گم ہوتے دکھائی دیئے۔ بس! اس سے آگے اس سے نہ جایا جائیگا۔ وہ اتنی دور تک بھی کیسے آگیا۔ اسے خود اس بات پر حیرت تھی۔ اس کے پاؤں بڑھ ہی نہیں سکتے۔ اس کے جسم میں جان ہی نہیں۔ اس کی آنکھیں بند سی ہوئی جاتی ہیں۔ اسے اپنی امیدوں کے سب قلعے مسمار ہوتے ہوئے دکھائی دیئے۔

اس وقت مس والٹن کی میٹھی، کیف بھری، زندگی بخش، ملاحت بار آواز پھر سنائی دی "حیڈر! تھک گیا۔ بس ڈو فرلانگ اور تم جیت جائیگا!"

لیکن حیدر نہیں ہلا۔

مس والٹن کو اپنے تصورات کی دنیا برباد ہوتی ہوئی دکھائی دی۔ اگر حیدر یہ بازی نہ جیت سکا تو وہ سب عقیدت جو اس کے دل میں حیدر کے لئے پیدا ہوئی تھی ہوا ہو جائے گی۔ اس نے پھر ایک بار حوصلہ افزائی کے لہجہ میں کہا۔

"حیڈر ہم تمہارے لئے سب کچھ کرے گا۔ تم ہیں آدمی ہیں بھرتی کرا دے گا۔ ہیں نوکر رکھے گا۔ تم ہیں پیار کرے گا۔ کم اپ، کم اپ" اور حیدر چل پڑا۔ گویا مس والٹن کی آواز میں بجلی کا اثر ہو۔

بنگلہ آگیا۔ مالی اور نوکروں نے دوڑ کر مس والٹن کا استقبال کیا۔ ایک نے حیدر کو بوجھ تلے دبے دیکھ کر اسے سہارا دینا چاہا۔ حیدر نے سر کے اشارے سے اسے ہٹا دیا۔ اسے بنگلہ تک پہنچنے کا ایک مبہم سا احساس تھا۔ اب یہاں تک پہنچ کر وہ اپنے کئے کرائے پر پانی نہ پھیرنا چاہتا تھا۔ وہ تیز چلنے لگا۔ منزل پر پہنچ کر مسافر کی رفتار تیز ہو جایا کرتی ہے۔

مس والٹن سیدھی اس کمرے میں گئی جو پیانو کیلئے ریزرو تھا۔ وہاں دوسرے نوکروں نے حیدر کی پشت سے پیانو اتروایا۔ حیدر ایک فاتح کی طرح سیدھا کھڑا ہو گیا۔ اس کا چہرہ چمک اٹھا۔ صاحب دوسرے کمرے میں سامان رکھوا رہے تھے۔ مس والٹن نے نوکروں سے ادھر اُن کا ہاتھ بٹانے کو کہا۔ اس لمحہ حیدر کا سر جھک گیا اور وہ بیٹھ گیا۔

اپنے ریشمی رومال سے اس کے چہرے کو پونچھتے ہوئے مس والٹن نے جذبات کے زیر اثر اس کی گوری پیشانی کو چوم لیا۔ اور ہینڈ بیگ سے بٹوا نکال کر بیس روپئے کے نوٹ اس کے ہاتھ پر رکھ دیئے۔ لیکن نوٹ گر پڑے۔ مس والٹن نے شک کی نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔ حیدر کی آنکھیں پتھرا گئیں اور اس کا جسم اکڑ گیا تھا۔

مس والٹن حیران سی، سہمی سی اس کی طرف دیکھتی رہ گئی۔

اس وقت نوکر نے ایک پیتل کا ٹکڑا اندر پھینکا ”مس صاحبہ یہ نمبر کشتی ہی میں رہ گیا تھا“ مس والٹن نے دوڑ کر اسے اٹھا لیا۔ موٹے موٹے حروف میں لکھا ہوا تھا

”۴۳۲“

”پور حیدر“ (Poor Hydar) اس نے لمبی سانس لیتے ہوئے کہا۔ اور اس کی آنکھیں پُرنم ہو گئیں۔

زندگی

مئی کی تپتی دوپہر تینوں شہر کے باہر، بہت دور، مال کو پار کر کے لارنس روڈ پر چپ چاپ چلے جا رہے تھے — چندا کی ماں، چندا اور اس کا شوہر۔

چندا کی ماں سوچ رہی تھی — سنسار بس کس کے دن ایک جیسے رہتے جو ہمارے رہتے۔ چڑھنا گرنا یہ تو انسان کے ساتھ لگا ہوا ہی ہے — پھر انسان پر بس کرنیوالا کون؟ یہ تو وہی آسمان کی نامعلوم بلندیوں میں بسنے والا قادر مطلق کہلا رہی ہے۔ جو چاہتا ہے تو اپنے کھلونوں کو کمال کی چوٹی پر پہنچا دیتا ہے۔ چاہتا ہے تو زوال کی گہرائیوں میں پھینک دیتا ہے۔ پھر دکھ کیسا؟"

اور یہ سوچ سوچ کر جیسے وہ اپنے دل کو تسلی دیتی چلی جا رہی تھی۔ اکثر ایسا ہوتا

تھا۔ اکثر وہ اپنے دُکھے ہوئے دل میں اٹھتے ہوئے جذبات کو دبانے کی کوشش کیا کرتی تھی پر دل نہ مانتا تھا۔ اور اب وہ بھی، جب اس چلچلاتی دھوپ میں، سر کا پسینہ پاؤں میں بہہ رہا تھا۔ سڑک پر دیکھنے کو بھی کوئی درخت نہ تھا اور سامنے کٹھن منزل باقی تھی۔ اس کے دل میں کئی طرح کے خیالات اٹھ رہے تھے۔ کھلاڑی کو سکھ دکھ کا کھیل دیکھنا ہے تو شوق سے دیکھے مگر دکھ کے بعد سکھ دیکھ کر بھی تو وہ یہ کھیل دیکھ سکتا ہے۔ پہلے سکھ دینے کے بعد پھر دُکھ کے کولھو میں پیس ڈالنا کتنی بڑی سزا ہے، کتنی عبرتناک سزا۔ ایسا کرنے کے عوض وہ انسان کو اٹھا ہی کیوں نہیں لیتا۔؟ لیکن یہیں جیسے اپنے سوال کا جواب مل جاتا۔ اگر وہ انسان کو دُنیا کے اسٹیج سے اٹھا ہی لے تو گذشتہ زندگی میں اس نے جو گناہ کیئے ہیں ان کی سزا کون پائے؟ کئی بار انتہائے غم سے تنگ آکر اس نے موت کو بلایا تھا۔ لیکن جب تک پچھلے گناہوں کا بیسواں حصہ بھی باقی ہے کوئی نہیں مر سکتا تو پھر اسے ہی کیسے موت آجاتی؟ ..... پانچ بچوں کو جنم دیکر اس نے شمشان کی ٹھنڈی گود میں جا سُلایا۔ بڑھا چڑھا کاروبار اپنے سامنے برباد ہوتے دیکھا جن رشتے داروں کو خون پلا کر پالا تھا۔ ان کے ڈنک سہے اور بے گھر، بے در ہونے کے بعد خاوند کی یہ اندوہ ناک حالت! چندا کی ماں نے ایک سرد آہ کھینچی ——— نہ جانے قسمت میں ابھی کتنا دکھ سہنا بدا ہے؟ کونسے گناہوں کا پھل پانا باقی ہے؟

ایک بنگلے کی دیوار کے سائے میں چندا کی ماں رُکی۔ میلے دوپٹے کے دامن سے گردن پر پنچھڑتے ہوئے پسینے کو ہوا کرتے ہوئے اس نے ایک سرد آہ کھینچی۔ چندا اور اس کا شوہر بھی اس کے پاس جا کھڑے ہوئے۔ کچھ لمحے تک تینوں خاموشی سے اپنے خیالات میں محو کھڑے رہے۔ اور پھر کچھ دیر بعد چپ چاپ چل پڑے۔

چندا کو ماں پر غصہ تھا ——— بہت غصہ تھا۔ باپ کی ایسی بُری حالت اور لڑکی کو خبر تک نہ دی جائے! بچپن کے مسرت بھرے دن اس کی آنکھوں میں پھر گئے

اور اس کے ساتھ ہی اسے اپنے والد کی شفقت بھری گود اور میٹھی باتوں کی یاد آگئی۔ بھوگ پور میں اس کے والد کا اینٹوں کا بھٹہ تھا۔ خوب چلتا تھا اور اسی کی بدولت گاؤں میں ان کی خاصی عزت تھی۔ تب وہ بہت چھوٹی تھی۔ اتنے بچوں کے بعد ترس ترس کر حاصل کی ہوئی اکلوتی لڑکی ـــــــ اس کے والد اسے گود میں اٹھائے پھرتے تھے۔ تب بھوگ پور کے برساتی نالے پر ریلوے لائن کا پل نہیں بندھا تھا۔ برسات کے دنوں میں جب پہاڑوں پر بارش ہوتی، جیسے اپنی کھوئی جوانی واپس پاکر یہ برساتی نالہ اپنی مست البیلی چال سے بہنے لگتا۔ اور جب جوش میں آتا تو ریلوے لائن کو بہا لے جاتا۔ اس وقت اس کے جنوں انگیز رقص کو دیکھ کر چندا مسرت کے پروں پر جھولنے لگتی۔ جب بھی لائن بہہ جاتی، وہ اپنے والد کو وہاں لے چلنے پر مجبور کر دیتی اور بڑے اشتیاق سے دیکھتی کہ کس طرح مسافر اس پار کھڑی ہوئی گاڑی سے اتر کر سر پر گٹھڑیاں اٹھائے اور دھوتیاں اپنی ٹانگوں تک اٹھائے نالہ پار کر کے اس طرف کھڑی ہوئی گاڑی پر سوار ہوتے ہیں۔

دوپہر کے بڑے سائے میں وہ حساب کتاب دیکھ رہے ہوتے تو وہ کھیلتی کھیلتی آ جاتی۔ ان کے رجسٹر اٹھا کر پھینک دیتی۔ ان کی گود میں چڑھ جاتی اور مچل اٹھتی کہ ٹھنڈی ہوا میں شیشم کے گھنے درختوں کے نیچے اس کے ساتھ کھیلا جائے۔ اس کے والد چپ چاپ اپنی سڑک پر درختوں کے ٹھنڈے سائے میں اس کے ساتھ کھیلنے لگتے۔ ایسے موقعوں پر ہمیشہ ان کے منہ پر ایک عجیب مسکراہٹ کھیلنے لگتی اور وہ ہنس کر کہا کرتے صرف یہی ایک فقرہ؛ ـ

"تم بہت تنگ کرتی ہو چندو!"

اس کے بعد اگرچہ حالات آہستہ آہستہ بگڑتے گئے۔ بڑے بھائی اور ماما کے لڑکوں کی خود غرضی اور بیوفائی سے اگرچہ انہیں کئی بار اپنا کام بند کر کے دیس بدیس کی

ٹھوکریں کھانی پڑیں۔ پر چندا کے پاس انھوں نے غم کا سایہ تک نہ پھٹکنے دیا۔ اسے یاد تھا جب وہ اسکول جاتی تھی تو اس کے پاس اتنے گہنے ہوتے تھے جتنے نئی بیاہی دولھنوں کو بھی نصیب نہیں ہوتے۔ اسے وہ دن بھی یاد تھا جب اس کی شادی کے وقت کافی روپیہ نہ ہونے پر اس کے والد نے اپنا چلتا چلاتا بھٹہ اپنے بھائی کے ہاتھ فروخت کر دیا۔ اور اس بڑھاپے کی حالت میں بھی بیکاری کے بھیانک اژدہا کا شکار ہونا منظور کیا تھا۔

وہی اس کے پتا جب اتنے بیمار ہوئے کہ ہوش و حواس تک کھو بیٹھے تو اسے خبر تک نہ دی گئی۔ وہ اپنے شوہر کے ساتھ لاہور کی دلچسپیوں کا لطف اٹھاتی رہی۔ اور اس کے پتا ــــــ سوچتے سوچتے اس کا گلا بھر آیا۔ اس نے اپنی ماں کی طرف دیکھا۔ ہڈیوں کا پنجر جسم۔ قریباً اندھی آنکھیں۔ میلے کپڑے۔ گھسی ہوئی ایڑی کا جوتہ۔ لئے گویا مصیبتوں کے بوجھ سے جھکی ہوئی اپنے آپ میں کھوئی چلی جا رہی تھی۔

چندا نے پوچھا "ماں! اب انھیں ہوش ہے کیا؟"

ماں جیسے خواب سے بیدار ہوئی ــــــ "ہاں پہلی بار جب میں آئی تھی تو انھیں آدمیوں کی پہچان تھی!"

چندا نے پھر پوچھا "اور ماں ان سے کام تو نہیں کرایا جاتا؟"

"نہیں بچی! وہ کام کرتے ہی نہیں۔ چوکیدار ہی اس دن کہہ رہا تھا کہ اور تو سب کام کرتے ہیں لیکن پنڈت کچھ نہیں کرتے۔ سارا سارا دن پوجا پاٹ میں محو رہتے ہیں۔"

"اور ماں ان کی صحت کیسی ہے؟"

"پہلے سے تو اچھی ہی معلوم ہوئی بیٹی!"

ایک بنگلے کے پھاٹک پر ایک خوبصورت بیل چڑھی ہوئی تھی اور اس پر چھوٹے چھوٹے سُرخ پھول لگے تھے۔ چندا کی ماں نے کہا ——— "مجھ سے نہیں چلا جاتا۔ آپ بیں تو کچھ دیر یہیں بیٹھوں گی۔" اور یہ کہتے ہوئے اپنے داماد اور لڑکی کا جواب پائے بغیر وہ اس طرف بڑھی۔ چندا کا خاوند سوٹ اور ہیٹ میں ملبوس تھا۔ چندا بھی خوبصورت ساڑھی پہنے ہوئے تھی۔ اس لئے وہ تو کھڑے رہے مگر ماں کو تو کوئی جھجک نہ تھی۔ ہاتھ کا برتن زمین پر رکھ کر وہیں گرم دھول پر بیٹھ گئی۔

چندا کے شوہر نے ایک دبی نگاہ سے اپنی ساس کی طرف دیکھا۔ گرد سے اَٹے ہوئے روکھے خشک بال، ڈھیلے لٹکتے ہوئے بپوٹے۔ جھریاں اور کثرتِ غم سے مُرجھایا ہوا چہرہ۔ ایک سرد آہ کو نکل پڑنے سے اس نے زبردستی روک لیا اور اس کی آنکھوں کے سامنے ماضی کے کئی برس لمحوں کی طرح گذر گئے۔

شادی سے پہلے سُسرال کے متعلق، وہاں کے محبّت بھرے ماحول کے متعلق، اس نے تصور کے کتنے محل بنائے تھے ——— ساس کا ماں سے بھی زیادہ گہرا کھُلا پریم، اپنے داماد کی تعریف کرتے وقت غرور سے کھلا ہوا چہرہ۔ کھاتے کھلاتے وقت کے اصرار۔ میٹھی جھڑکیاں اور طعنے۔ تصور کے کس مسرت انگیز ماحول میں وہ بسا کرتا تھا؟

لیکن کتنی جلدی وہ محل مسمار ہو گئے۔ شادی کے دن ہی اس نے محسوس کیا تھا جیسے ماحول کچھ بوجھیلا سا ہے۔ گویا کہیں نہ کہیں کوئی بات ضرور ہے۔ شادی میں بارات کو خوب کھلایا پلایا گیا تھا جہیز بھی کم نہ دیا گیا تھا۔ دوسری رسوم میں بھی کسی طرح کی کمی نہ آنے دی گئی تھی۔ پھر اس نے محسوس کیا تھا کہ جیسے یہ سب خوشی تکلّف کے پردے میں ڈھکی ہوئی ہے۔ ساس کو اس نے دیکھا۔ دبی دبی، گھٹی گھٹی، ڈری ڈری۔ اور غصہ کو اس نے پایا۔ خاموشی، متین، کھویا کھویا سا۔ بس ایک بار جب لڑکی کے وداع

ہونے کا وقت آیا۔ اور چندا اونچی آواز سے روکر اپنے باپ کے گلے سے چمٹ گئی تب اس سنجیدہ متین شخص کے چہرے پر بھی اس نے ایک مایوس ہنسی دیکھی تھی اور سُنا تھا۔ "ایں بچپن نہ کرو۔ بس بس! چلو اب بیٹھو تانگے میں!"

سوچتے سوچتے اس کے دل کی گہرائیوں سے ایک لمبی سانس نکل گئی۔ اس کی سانس اکھڑی ہوئی اور نبضیں چلنے لگے۔ لارنس روڈ ختم ہوگئی اور جیل روڈ آگئی۔ تینوں خاموشی سے اس پر ہولئے۔ وہ پھر ماضی کے اوراق میں گم ہوگیا۔

شادی کے بعد وہ ایک دو بار سسرال گیا تھا۔ ان دنوں اگرچہ اس کی خوب خاطر تواضع کی گئی لیکن وہ کمی جو اس نے شادی کے دن محسوس کی تھی تب بھی محسوس کی۔ اور آخر ایک دن اسے اس کی وجہ بھی معلوم ہوگئی۔ چندا نے ہاتھ جوڑ کر بھرے ہوئے گلے سے اسے سب کچھ بتا دیا۔ اور درخواست کی کہ وہ اس کے ماں باپ کو معاف کردے۔ اپنے باپ کے اچھے دنوں کا خاکہ کھینچتے ہوئے اس نے اسے بتایا کہ ان کے پاس جو کچھ تھا انھوں نے شادی میں لگا دیا۔ اور اب نہ ان کے پاس مکان ہے نہ دکان، اور بیٹھے پر بھی ان کا کوئی اختیار نہیں۔ اس لئے وہ اب اس سے بات کرتے ہوئے شرماتے ہیں۔

نہ جانے کیوں جگت رام کو اپنے خسر سے کچھ ہمدردی سی رہتی تھی۔ ان کے چہرے پر کچھ ایسا درد، کچھ ایسا سوز، کچھ ایسا غم تھا کہ جب اس نے محسوس کیا کہ اس کے جانے سے انھیں تکلیف ہوتی ہے تو اس نے سسرال آنا جانا کم کر دیا۔ بلکہ چندا کو بھی اس نے زیادہ تر لاہور ہی رکھا۔ پہلے تو وہ کبھی کبھی سسرال جاتا بھی پر ادھر ایک سال سے وہ گیا ہی نہ تھا۔ تب ہی اچانک ایک دن اس نے چندا سے سنا کہ اس کا خسر پاگل ہوگیا ہے۔ اور لاہور کے پاگل خانہ میں داخل کرا دیا گیا ہے اور اس کی ساس ایک سیٹھ کے گھر رسوئی کا کام کرکے زندگی گذار رہی ہے۔ اسے یاد ہے وہ بہوت

سارا کھیل بگڑ گیا تھا۔ اس کی امیدوں کے محل مسمار ہو گئے تھے، لیکن ان کے کھنڈرات تک مٹ جائیں گے یہ اس نے کبھی نہ سوچا تھا۔

چندا کی ایک بچپن کی سہیلی لاہور ہی میں رہتی تھی۔ وہ اپنے میکے ہو کر آئی تو چندا بھی اپنے ماں باپ کی خبر پوچھنے اس کے پاس پہونچی۔ تبھی اسے یہ سب کچھ معلوم ہوا۔ ناک بھوں سکیڑتے ہوئے اس کی سہیلی نے کہا:۔

"تم بھی چندا خوب ہو۔ وہاں تمھارا باپ پاگل ہو گیا ہے۔ پاگل خانہ میں داخل کرا دیا گیا اور تم خبر تک نہ لینے گئیں۔ بستی میں تو کائیں کائیں ہو رہی ہے"

اسی دن چندا نے اپنے شوہر سے یہ منت کہا تھا ——— "مجھے میری ماں سے ملا دو۔ میں اس سے سب حال پوچھنا چاہتی ہوں" اور اسی شام ذرا اندھیرا ہوتے ہی وہ اسے لیکر اس سیٹھ کے ہاں پہونچا تھا۔ چندا کی ماں سے ملاقات ہونے پر دونوں نے اس سے اصرار کیا تھا کہ وہ نوکری چھوڑ کر ان کے ساتھ رہے۔ آخر داماد اور بیٹے میں فرق ہی کیا ہے۔ لیکن وہ نہ مانی تھی اور جب اس نے بتایا تھا کہ بھائی کے ہاتھوں بےعزت ہونے پر انھوں نے کچھ یونہی بکنا شروع کر دیا تھا۔ شاید ہاتھ بھی اٹھایا ہو جس پر ظالم بھائی نے انھیں پاگل مشہور کر دیا۔ اور پاگل خانہ میں داخل کرا دیا۔ ورنہ کوئی ایسے پاگل تو وہ نہیں تھے" تب دونوں کے دلوں کو کچھ تشفی ہوئی۔

گلی کی مدھم روشنی میں دیوار کے سایہ میں تینوں کھڑے تھے۔ اس وقت یہ فیصلہ کیا گیا کہ اگر انھیں ہوش ہو تو ڈاکٹر سے مل کر انھیں پاگل خانہ سے نکلوا لیا جائے اور ایک الگ مکان لیکر انھیں وہاں رکھا جائے۔ اور چندا کی ماں بھی وہاں رہے۔ اور یہ بات وہ مان بھی گئی تھی۔ یہی وجہ تھی کہ آج اس تپتی دوپہر میں وہ پاگل خانہ کو جا رہے تھے

چندا کے شوہر نے ایک لمبی سانس لی۔ اپنی ساس کے خلاف، ساس کے خلاف [illegible] رسم و رواج کے خلاف اس کے دل میں نفرت کا سمندر موجزن ہو اٹھا

اس کی ساس تانگے پر چلنے کیلئے تیار نہ ہوئی تھی۔ شاید اس کے پاس کرایہ دینے کے لئے پیسے نہ تھے۔ اور یا تھے تو وہ سب اس نے اپنے خاوند کیلئے باداموں کی گریاں اور دودھ لینے میں صرف کر دیئے تھے۔ اور چونکہ لڑکی کا پیسہ لینا پاپ ٹھہرا اس لئے اس قیامت کی دھوپ میں وہ تین میل پیدل چل کر آتے تھے۔

پاگل خانہ کے باہر چھوٹے سے باغیچے میں تینوں بیٹھ گئے۔

ابھی پھاٹک کھلنے میں دیر تھی۔ اور ڈاکٹر جس سے چندا کا شوہر ملنا چاہتا تھا، نہ آیا تھا۔ اس لئے کچھ دیر تک انتظار کرنا ناگزیر تھا۔

یہاں گھنے درختوں کے نیچے کچھ ٹھنڈک تھی۔ اور ہوا ابھی کچھ میٹھی میٹھی سی چلنے لگی تھی۔ ماں نے باداموں کی گریاں ایک طرف اور دودھ کا برتن دوسری طرف رکھ دیا۔ اور گھاس پر لیٹ گئی۔ چپ چاپ۔ آم کے درختوں پر آتے ہوئے بور کو دیکھتے دیکھتے اس کا تصور پر لگا کر اڑنے لگا ______ سکھ کے بعد دکھ اور دکھ کے بعد سکھ کہ تو اتنا دکھ سہنے کے بعد سکھ کے دن ضرور آئیں گے۔ ہفتہ میں دو بار اسے اپنے خاوند سے ملنے کی اجازت ہوتی۔ اور اس اثنا میں وہ نوکری کر کے جو بچا سکتی۔ اس کے بادام لے گریاں نکال، دودھ اور مصری لیکر کڑی دھوپ میں پیدل اتنی لمبی، سپاٹ، تپتی سڑکیں پار کر کے پاگل خانہ آتی اور بڑی محبت اور عقیدت سے اسے بادام کھلا کر دودھ پلاتی تھی۔ اسے اس بات کا پورا یقین تھا کہ غذا کی کمی اور رشتہ داروں کے مظالم ہی کے باعث اس کے خاوند کا دماغ کچھ خراب ہو گیا ہے۔ جیسے ہمیشہ دودھ بالائی، دہی اور لسی ملے۔ اسے اتنے دنوں فاقوں رہنا پڑے اور پھر بے عزتی! وہ انھیں یاد آیا تو پھر باداموں کی گریاں کھلا جاتی۔ پھر مصری ڈال کر دودھ پلاتی اور پھر تصور ہی میں ان دونوں کا نظارہ کرتی۔ جب اس کا خاوند اچھا ہو جائیگا اور اس

اتنا ہیں کچھ روپیہ جمع کر کے اس کیلئے ایک چھوٹی موٹی دوکان کھول دیگی۔ اور زندگی کے جو کچھ دن باقی ہیں آرام سے گذر جائیں گے۔

گھاس پر بیٹھی ہوئی چندا سامنے لوہے کے اونچے مہیب پھاٹک کی طرف دیکھ رہی تھی۔ باہر ایک سکھ سنتری پہرہ دے رہا تھا۔ نہ جانے اس کے اندر کتنی ان گنت کوٹھڑیاں ہیں۔ اور نہ جانے ان میں سے کس کوٹھڑی میں اس کا باپ پاگل بنا کر بند کر دیا گیا ہے۔ نہ جانے کس طرح اس گرمی میں اپنی کوٹھڑی میں لیٹا ہو اور وہ نتھے دنوں کو یاد کر رہا ہے۔ اسے ضرور ہی اپنی لڑکی کی یاد آتی ہوگی اور وہ ضرور اسکو خود غرض اور سنگ دل سمجھتا ہوگا۔ ادھر اسے ان سب باتوں کی کچھ خبر ہی نہیں۔ چندا کا گلا بھر آیا اور وہ آنچل سے اپنا منہ ڈھانپ کر رونے لگی۔

دونوں ہاتھ گھاس پر ٹکائے پیچھے کی طرف جھکا ہوا اس کا شوہر دل ہی دل میں اس مکالمہ کو دوہرا رہا تھا جو ابھی کچھ دیر بعد اسے پاگل خانہ کے ڈاکٹر سے کرنا تھا اگرچہ اس کے پاس سفارشی چٹھی تھی لیکن پھر بھی اسے معلوم تھا کہ ڈاکٹر کو وجہ بتلانی ہوگی کہ کیوں پنڈت کو پاگل خانہ سے گھر لے جانا ضروری ہے؟ کئی طرح کے دلائل اس نے اپنے دل میں سوچ لئے تھے اور انگریزی کے کچھ چست فقرے وہ اپنے من میں دوہرا رہا تھا۔

چار بجے بڑا پھاٹک کھلا اور پاگلوں کی ایک ٹولی۔ موٹے کھردرے کپڑے کی لمبی ڈھیلی قمیص اور ٹخنوں سے اونچے پاجامے پہنے نکلی۔ کوئی اپنے آپ سے باتیں کر رہا تھا کوئی یونہی ہنس رہا تھا۔ ان کے ساتھ جو سنتری تھا اس نے انہیں ایک جگہ سے پھولوں کے گملے اٹھانے کو کہا۔ سب نے گملے اٹھا لئے۔ اور وہ سنتری انھیں لیکر شاید کہیں دوسری جگہ رکھوانے کے لئے چلا گیا۔ اسی طرح دوسری ٹولی نکلی اور گملوں کو پانی دینے لگی۔ سب پاگل تھے۔ عجیب عجیب حرکتیں کرتے تھے لیکن پھر بھی بھلے ہوتے

جانور کی طرح سب کام کئے جاتے تھے۔ دیکھتے دیکھتے چندا بے چین ہو اٹھی۔ اس کا دل جیسے اس کے حلق میں آ گیا۔ اس کے والد کو بھی ضرور یہی کام کرنا پڑتا ہوگا۔ اور یہ ظالم سنتری نہ جانے کس طرح مار مار کر ان پاگلوں کو کام پر لگاتے ہیں۔ بالکل اسی طرح جیسے جنگلی جانوروں کو، جو دماغ سے کام نہیں لے سکتے۔ یہ پھر بھی ڈنڈے کی مار سے سب کچھ سیکھ لیتے ہیں۔ وہ اپنے باپ کو ایک لمحہ کے لئے بھی یہاں نہ رہنے دیگی۔ اور یہ سوچ کر اس نے کسی گہری سوچ میں غرق آسمان کی طرف دیکھتے ہوئے اپنے شوہر سے کہا "سنتری سے کہو کہ ہمیں ان سے ملادے!"

اس کا شوہر کچھ چونک کر اٹھا۔ اپنا کالر اور ٹائی درست کرتا ہوا وہ پھاٹک پر گیا، سنتری سے اپنا تعارف کرایا۔ درخواست کی کہ ہمیں پنڈت جمناداس سے ملاقات کرنی ہے۔ اور یہ کہتے ہوئے الگ سے جاکر ایک روپیہ بھی اس نے سنتری کے ہاتھ میں رکھ دیا۔

چار جمناداس اس وقت پاگل خانہ میں تھے۔ سنتری نے فہرست دیکھکر چوکیدار سے کہا کہ بستی غزان والے جمناداس کو بلا لائے۔ اس اثنا میں کئی دوسرے پاگلوں کے رشتے دار بھی آ گئے اور سنتری ان کی درخواست کے مطابق فہرست دیکھ دیکھ کر پاگلوں کو بلانے لگا۔ بڑے پھاٹک کے باہر سے ملاقات کرنے کی اجازت تھی۔ لیکن ان کو اس نے پھاٹک کے اندر داخل کر لیا۔ چندا اور اس کا شوہر ایک بنچ پر بیٹھ گئے۔ ماں دھرتی پر ہی بیٹھی۔ تبھی ایک چوکیدار کے ساتھ انھوں نے پنڈت کو آتے ہوئے دیکھا۔

چندا کا دل دھک دھک کرنے لگا۔

نزدیک آجانے پر اس نے دیکھا۔ دوسرے پاگلوں کی طرح اس کے پتا کے گلے میں بھی موٹی کھردری سوتی قمیص اور کمر میں پاجامہ ہے۔ اس کا گلا بھر آیا اور آنکھیں

ڈبڈبا آئیں۔

چوکیدار نے کہا ——— "بیٹھ جاؤ" اور ایک سلے ہوئے مسکین جانور کی طرح پنڈت دیوار کے ساتھ پیٹھ لگا کر بیٹھ گیا۔ پھر چوکیدار کی طرف اور پھر ان تینوں کی طرف دیکھ کر ہنس دیا۔

چندا کے شوہر نے دیکھا کہ اس کا خسر آدھا بھی نہیں رہا ہے۔ اس کے دانتوں پر پیلی میل جمی ہوئی ہے۔ اس کے چہرے پر زردی چھائی ہوئی ہے۔ اور جب چندا کی ماں نے پوٹلی کھول کر بادام کی پڑیا اس کو دی تو چندا کے شوہر نے دیکھا ——— اس کا ہاتھ کانپ رہا ہے۔

سب گریاں ایک دو پھنکوں ہی میں پنڈت نے چبا ڈالیں تب چندا کی ماں دودھ میں مصری گھولنے لگی۔

لیکن چندا کو اتنی تاب کہاں۔ اس نے ماں سے پوچھا ——— "ماں یہ ہمیں پہچانتے نہیں؟"

اپنی کمزور اور نیم اندھی آنکھوں سے اپنے خاوند کو دیکھکر ماں نے کہا "کیوں نہیں!" اور پھر سر کا دوپٹہ ذرا اونچا کر کے چندا کی طرف اشارہ کر کے اس نے خاوند سے پوچھا "کیوں اس کو پہچانتے نہیں؟"

"پہچانتا کیوں نہیں!" ہنستے ہوئے پنڈت نے کہا۔

"بھلا کون ہے یہ؟"

"میری بیوی! اور کون؟"

چندا نے ساڑھی کے آنچل سے منہ ڈھانپ لیا اور اس کے شوہر نے اس کی سسکی سنی۔

تب چندا کی ماں نے اپنے داماد کی طرف اشارہ کرتے ہوئے پوچھا۔

"بھلا یہ کون ہیں؟"

"ہمارے بھائی ہی تو ہیں!" یہ کہہ کر پنڈت نے سب کی طرف اس طرح دیکھا گویا کہہ رہا ہو "کیا تم سب نے مجھ کو پاگل سمجھ لیا ہے؟"

اداس سی ہو کر چندا کی ماں نے پوچھا "کیا مجھے بھی نہیں پہچانتے؟"

"واہ!" پنڈت نے ایک قہقہہ لگایا "تم میری ماں جو ہو" اور یہ کہہ کر اور پھر زور سے ہنس کر اس نے دودھ کا برتن اپنی بیوی سے چھین لیا اور غٹ غٹ پینے لگا۔

شاعر کی شکست

ہم دونوں گیلری سے گذر کر اس کمرے میں داخل ہوئے۔ وہ ایک بڑے اسٹول پر بیٹھا اپنے کام میں محو تھا۔ ہمیں دیکھتے ہی اس نے بھاری رجسٹر سرکایا اور اسٹول سے اُتر کر ہم سے مصافحہ کیا اور پھر حسبِ معمول بناوٹی مسکراہٹ کے ساتھ میری طرف کرسی سرکا کر میز کے کونے پر بیٹھ گیا۔

چند لمحوں کیلئے میں اپنے آنے کا مقصد بھول گیا۔ اور اس کی اس اداسی میں گویا جذب ہو کر اس کا سبب تلاش کرنے لگا۔ اس وقت ہی کیوں جب بھی میں اس کے کمرے کے پاس سے گذرتا اور اسے اونچے اسٹول پر بیٹھا رقوم کے اندراج میں محو دیکھتا تو ایک دو لمحوں کیلئے رک جاتا۔ اس کی طرف ٹکٹکی باندھ کر دیکھتا اور اس کے دل کی گہرائیوں میں اتر جانے کی کوشش کرتا۔

چھ سال پہلے جب وہ لاہور گیا تھا اس کے کلام کی دھوم پنجاب تو کیا تمام ہندوستان میں مچ گئی تھی۔ لوگ اس کی نظمیں پڑھ کر بیتاب ہو جاتے تھے۔ میں خود انھیں پڑھ کر وجد میں آجاتا تھا۔ لیکن چھ ماہ ہوئے وہ لاہور کی دلچسپ اور دلفریب دُنیا کو چھوڑ کر خشک اور بے کیف جالندھر میں آگیا تھا۔ اس کے بعد اس کی کوئی نظم بھی کسی رسالہ میں نہ دیکھی تھی۔

"تشریف رکھیے آپ"

بلونت نے برج کشور کی طرف دیکھ کر کہا جو اب تک اسی طرح کھڑا تھا۔

میں نے بھی کہا "بیٹھ جا برج" اور وہ بیٹھ گیا۔

"یہ میرے دوست مسٹر برج کشور مدیر "نئی دُنیا" ہیں"

"مدیر نئی دنیا!"... وہ ہنسا کھوکھلی اور روکھی ہنسی۔ اور پھر اس نے اٹھکر اٹھ کر برج سے ہاتھ ملایا اور اپنی جگہ بیٹھ گیا۔ وہ مصنوعی شگفتگی جو ایک لمحہ کے لئے اس کے چہرے پر آئی تھی مفقود ہو گئی۔

"فرمائیے کیسے آنا ہوا؟" اس نے پوچھا۔ میں بولا "یہ میرے دوست آپ کے بے حد مداح ہیں۔ ان کا رسالہ تقریباً ایک سال سے علم و ادب کی خدمت کر رہا ہے۔ یہ تو پسند نہیں کرتے لیکن ادبی دُنیا میں کچھ رواج سا ہو گیا ہے۔ اور یہ بھی اس کی رَو میں بہہ گئے ہیں۔ چنانچہ سالانہ نمبر نکالنے کی تیاریوں میں مصروف ہیں۔ اسی سلسلہ میں انھوں نے مجھ سے بارہا اصرار کیا کہ تم سے کوئی چیز لے دوں۔ میں ٹالتا رہا لیکن آج یہ لاہور ہی سے تشریف لے آئے۔ تو مجبوراً آنا پڑا۔ اب بھائی میرے آنے کی لاج رکھو"

بلونت کچھ دیر تک پاؤں کے انگوٹھے سے فرش کو کریدتا رہا۔ پھر اس نے کہا "عرصہ ہوا میں نے تو لکھنا چھوڑ دیا ہے"

"میں انھیں پیشتر ہی سمجھا چکا ہوں لیکن یہ مانتے ہی نہیں۔ کہتے ہیں میں قدم پکڑ لوں گا۔ نظم لیکر رہوں گا . . . "

"آپ جیسے ادب نواز مہربانوں کے بھروسے پر ہی میں نے یہ حماقت کردی ہے" برج کشور نے قطع کلام کرتے ہوئے کہا۔

بلونت خاموش رہا۔

"چار پانچ اشعار کافی ہیں" برج بولا "میں اس عنایت کیلئے تمام عمر ممنون رہوں گا"

بلونت کسی قدر مسکرایا۔ لیکن یہ مسکراہٹ درد اور طنز کا پہلو لئے ہوئے تھی۔

میں نے اصرار اور گلے کے لہجہ میں کہا "بلونت آخر تم لکھو گے کیوں نہیں؟"

"دل نہیں چاہتا"

میں نے کرسی سے اٹھتے ہوئے ایک قہقہہ لگایا اور اس کے کندھے کو تھپتھپاتے ہوئے کہا "بس اب سیدھے ہاتھوں نظم دیدو۔ یہ بھی کوئی بات ہے۔ دل نہیں چاہتا۔ میں چل کر آیا ہوں۔ یہ اتنی دور سے تشریف لائے ہیں"

اس کی نگاہیں سنجیدہ ہوگئیں۔ اس نے کہا . . "تم مجھے تنگ نہ کرو۔ میں نظم کہنا چھوڑ چکا ہوں"

میں نے اس کی طرف دیکھا۔ گویا پوچھ رہا تھا "آخر کیوں؟"

بلونت بولا "تم نے بارہا اصرار کیا ہے لیکن میں خاموش رہا۔ اب یہ اتنی دور سے چل کر آئے ہیں شاید یہ سمجھیں میں ٹال رہا ہوں۔ اس لئے کہتا ہوں کہ درحقیقت میرے جذبات عہد گذشتہ کے ساتھ دفن ہو چکے ہیں اور اب انھیں زندہ نہیں کیا جا سکتا۔ میں نے لکھنا ہی چھوڑ دیا ہے۔ کیوں؟ سنو!"

میں کرسی میں دھنس گیا۔ ایک لمحہ کیلئے کمرے میں خاموشی چھا گئی۔ صرف ساتھ

کے ہال میں لگا ہوا کلاک ٹن ٹن کر رہا تھا۔ بلونت بولا :-

(۲)

"چھ سال ہوتے ، یہی دن تھے۔ جب میں خوشی خوشی جالندھر سے روانہ ہوا تھا۔ تم مجھے اسٹیشن پر الوداع کہنے گئے تھے۔ میں خوش تھا میرے دل میں جوش تھا۔ وہی جوش جو جنگ میں جانے والے سورما کے دل میں ہوتا ہے۔ بیکسی ، یہ بزدلی مفقود تھی۔ زندگی سراپا رومان تھی۔ جس میں دل آسمان کی انتہائی بلندیوں میں اُڑا جاتا تھا۔ ہوا میں ہزاروں قلعے بنائے اور بگاڑے جاتے تھے۔ بلندی کے خیال میں پستی کو دخل تک نہ تھا۔ ترقی سامنے کھڑی رقص کر رہی تھی۔ اس کے بعد تین سال مسلسل خوشی کے سال تھے۔ تمام دن لکھتا پھر بھی نہ تھکتا۔ ہندوستان کا کوئی اخبار کوئی مشہور رسالہ نہ تھا جس میں میری نظمیں شائع نہ ہوتی ہوں۔ لوگ انھیں پڑھتے تھے، میری تعریف کرتے تھے۔ میں مسرت کے سمندر میں کھو جاتا تھا۔ اس وقت ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے پہاڑ کی سب سے بلند چوٹی پر اُڑا جا رہا ہوں۔ یہ تین سال ، یہ تین سال ہی میری زندگی کا ماحصل ہیں۔ کاش وہ زمانہ پھر آ جائے۔ میری نظموں میں غم و مسرت رنج و شادمانی کے جذبات اس طرح رقص کرتے گویا طلائی زیور میں ہیرے چمک رہے ہیں۔

مجھے بیسیوں خط موصول ہوتے لیکن وہ سب صنفِ قوی کی طرف سے آتے تین برس کے بعد مجھے اس کا خط موصول ہوا۔ نام میں نہ لوں گا۔ نام پوچھ کر تم کیا کرو گے؟ وہ خود شاعرہ ہے۔ ایک نفیس شاعرہ۔ اس کے اشعار نزاکت اور نسائیت سے معمور ہوتے ہیں۔ ان دنوں اسے لکھنا شروع کئے تھوڑی مدت ہی گذری تھی لیکن اچھے سے اچھے ہندی ماہناموں میں بھی اس کی نظمیں خاص شان سے شائع ہوتی تھیں۔ میں نے رسالوں میں اس کی تصویر دیکھی تھی۔ جب بھی میں اس کی کوئی نظم پڑھتا تھا اس کا

مسکراتا ہوا چہرہ میری آنکھوں کے سامنے پھر جاتا تھا۔

اس کا خط کیا تھا بہترین الفاظ کا ایک حسین مجموعہ جس کے ایک ایک نقطہ سے محبت چھلکی پڑتی تھی۔ وہ ایک لہر تھی جو میرے خیالات کو، میرے تصورات کو، میرے خوابوں کو اپنی رو میں بہا لے گئی۔ اس کے بعد میں کیا کرتا رہا محبت کی کتنی بلندی پہ پہنچ گیا یہ لمبی داستان ہے لیکن جب گرا، جب ٹھکرا دیا گیا تو معلوم ہوا جہاں سے چلا تھا وہاں سے نیچے بہت نیچے جا گرا ہوں۔

اس وقت میری حالت اس شخص کی سی تھی جس کا جہاز تباہ ہو گیا ہو اور جو سمندر کی کسی چھوٹی سی چٹان پر کھڑا ادھر ادھر ایک حسرت بھری نگاہ ڈالتا اور پھر سر جھکا کر موت سے ٹکریں لینے لگ جاتا ہے یا اس مسافر کی سی جو شام کی بڑھتی ہوئی تاریکی کا تصور کر کے ڈوبتے ہوئے سورج کی طرف ایک یاس آمیز نگاہ ڈال کر گرم ریت پر لیٹ جاتا ہے۔

اس وقت بھی میرا دل لاہور سے بھاگ جانے کو چاہتا تھا لیکن میری شہرت نے مجھے نہ چھوڑا۔ ویاس جی نے انہیں دنوں لاہور سے "ستیا سنسار" نکالنا شروع کیا تھا۔ پنجاب میں ہندی کا یہ پہلا ادبی رسالہ تھا۔ اس لئے خوب چل نکلا کئی مہینوں سے وہ نظموں کیلئے اصرار کر رہے تھے لیکن میں کسی اور ہی دنیا میں گم تھا نظم لکھنے کی فرصت ہی کسے تھی۔ اب پھر لکھنے لگا۔ دل پر چوٹ لگی ہوئی تھی نظموں میں دل کی جلن نکالنے کے علاوہ کوئی علاج نہ تھا۔ اس لئے جو کچھ کہتا تیر و نشتر ہو جاتا۔

ایک ہی سال میں میں نے اپنا غم بدل لیا۔ تازہ خوشی نے عارضی دکھ کو بھلا دیا!"

(۳۴)

کچھ لمحوں کیلئے خاموش رہا۔ پھر بولا:۔

"اب پھر میری نظموں کی دھوم ہوگئی۔ پھر میرے پاس میرے مداحوں کے خط آنے لگے۔ ان میں عورتوں کے بھی ہوتے مردوں کے بھی۔ کئی عنایت ناموں میں محبت کی چاشنی بھی ہوتی۔ لیکن میرا دل سخت ہو چکا تھا۔ اور اب اس میں اس لطیف جذبہ کے لئے جگہ نہیں تھی۔ میں شاید ہی کسی کا جواب دیتا۔ . . . . . شاید ایک دفعہ چوٹ کھا کر محبت کا احساس ہی جاتا رہا تھا۔ اب میں دن رات اطمینان اور طمانیت سے نظمیں کہتا۔ خرچ چلانے کیلئے میں نے ایک اخبار میں کچھ وقت کیلئے ملازمت کر لی تھی اور ایک طرح کی ادبی زندگی ہی گذار رہا تھا"

ایک لمحہ کیلئے بلونت چُپ ہو گیا۔ پھر ایک گہرا سانس لیکر کہنے لگا :۔

"اچھی طرح یاد ہے اس دن میں اپنی کتاب کی آخری نظم کہہ رہا تھا۔ نظموں کے تمام مسودے میرے سامنے پڑے تھے۔ جب کوئی مصرع حسب خواہش نہ بنتا تو دوسری نظم پڑھنے لگ جاتا"

بیخودی میں بلونت نے ایک چھوٹا سا رجسٹر سامنے رکھ لیا اور اس کے اوراق پلٹتے ہوئے بولا۔

"اور پھر اچانک ہی وہ مصرع اتر آتا۔ ایسا اچھا کہ میں خود اسے بار بار ـــــ آواز نہ رکھنے کے باوجود بھی ـــــ گا گا کر پڑھتا۔ میں اپنی غیر مطبوعہ نظموں کا جو مجموعہ شائع کرنا چاہتا تھا یہ اس کی آخری نظم تھی۔ اور اس کا عنوان تھا "رخصت"! اس کا آخری بند ختم کرنے کے بعد بھی میں اسے دیر تک پڑھتا رہا۔ طبیعت کسی طرح سیر ہی نہ ہوتی تھی۔ جھوم جھوم کر پڑھ رہا تھا کہ آواز آئی "بابو جی!" دیکھا چٹھی رساں سامنے کھڑا تھا"

بلونت میز کے سہارے کھڑا ہو گیا اور کہنے لگا :۔

"اس کی آواز سُن کر میں چونک پڑا۔ اس نے خط کو میرے سامنے پھینک دیا۔ میں نے

اسے اٹھایا اور ایک ہی نظر میں پڑھ ڈالا مشن کالج کی کسی طالبہ نے میری ایک نظم پر تنقید کی تھی۔ اتنی تیز۔ اتنی سخت کہ میں بلبلا اٹھا۔

اس نے میری نظم کو معیار سے گری ہوئی بتلایا تھا۔ مجھے بے حد غصہ آیا۔ آگ سی لگ گئی۔ یہ سکنڈ یا تھرڈ ایئر میں پڑھنے والی لڑکی کیا جانے شاعری کس بلا کا نام ہے۔ میں نے اپنا مسودہ وہیں پٹک دیا اور اٹھ کھڑا ہوا۔"

یہ کہتے ہوئے بلونت نے رجسٹر میز پر پٹک دیا اور تیزی سے کہنے لگا۔

"ان دنوں "نیا سنسار" کا دفتر گوالمنڈی کے چوک کے نزدیک ریلوے روڈ پر واقع تھا۔ ویاس جی خود مکان کی بالائی منزل پر رہتے تھے۔ زینہ طے کر کے میں کمرے میں داخل ہوا مس کیلاش کا خط میری جیب میں تھا اور دل میں غصہ کے اٹھتے ہوئے جذبات ــــ اندر ویاس جی اور سروپ کشور بیٹھے ہوئے باتیں کر رہے تھے۔ سروپ بھی شاعر تھا۔ میرا حریف، خوبصورت اور خوبرو۔ اور سچ تو یہ ہے کہ کبھی کبھی خوب کہہ جاتا تھا۔ لیکن عام طور پر عامیانہ چیزیں لکھتا مشن کالج کا سینئر طالب علم تھا۔ مجھ میں اور اس میں خوب چلتی تھی۔ دونوں ایک دوسرے کی چیزوں میں نقص نکالا کرتے تھے۔ رسمی آداب کے بعد میں بیٹھ گیا۔

"فرمائیے کیسے آنا ہوا؟"

"یونہی درشن کرنے آ گیا" اور دلی جذبات کو دل ہی میں دبا کر میں بیٹھ گیا۔

سروپ بہت دیر تک بیٹھا رہا اور جب تک بیٹھا رہا ہنس ہنس کر باتیں کرتا رہا۔ مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے اس نے کیلاش کا خط پڑھ لیا ہو۔ گویا اسے میری تذلیل کی خبر ہو گئی ہو۔ چپ بیٹھا اس کے منہ کی طرف دیکھتا رہا۔ میں کافی باتونی ہوں لیکن نہ جانے کیوں اس دن بات ہی منہ سے نہ نکلتی تھی۔ سروپ کے جانے پر ویاس جی نے میری طرف ایک خط سرکایا اور آہستہ سے کہا "ملاحظہ فرمائیے!"

میں بسرعت تمام خط پڑھ گیا، لکھا تھا۔

شری مان دیاس جی۔

نمستے، میں نے بلونت جی کی نظم 'عورت' پڑھی۔ مجھے حیرت ہے کہ آپ نے ایسی لغو اور بے معنی نظم کو اپنے بلند پایہ رسالہ میں جگہ کیسے دی۔ یہ نظم صنفِ نازک کے لطیف دل پر سخت صدمہ پہنچاتی ہے۔ براہ کرم ایسی دل آزار نظموں کو "نیا سنسار" ایسے رسالہ میں نہ شائع کیا کریں۔

خیر اندیش

مس کے۔ بھنڈاری

میرا چہرہ اتر گیا۔ دیاس جی کو اپنا خط دکھانے کا حوصلہ ہی نہ کر سکا۔ وہ بولے۔

"کہو کیا کہتے ہو؟"

"آپ تو جانتے ہیں نظم کیسی تھی؟"

"جبھی تو اس خط کا جواب دے رہا ہوں۔"

"جواب لکھ رہے ہیں۔"

"ہاں!"

"ذرا انصاف سے کام لیجئے گا۔"

"مطمئن رہئے۔"

آداب عرض کے بعد میں گردن جھکائے دفتر سے باہر نکلا۔ جب آیا تھا اس وقت دل میں کتنا غصہ تھا۔ کتنا رنج۔ اب کتنی افسردگی کتنی تھکاوٹ۔

"تم پوچھو گے" بلونت نے سٹول پر بیٹھتے ہوئے پھر آہستہ آہستہ کہنا شروع کیا۔ "جب میں مشہور ہو چکا تھا تو میں نے اس خط کو اتنی اہمیت ہی کیوں دی۔ آج میں سوچتا ہوں تو خود حیران ہوتا ہوں۔ لیکن اس وقت میرا لکھنے کا شوق نیا نیا ہی تھا تین چار

سال کسی شاعر یا مصنّف کیلئے بہت نہیں ہوتے۔ جب تک اس کی دو چار کتابیں مارکٹ میں نہ آجائیں۔ تب تک چاہے رسالوں میں کتنی ہی نظمیں کیوں نہ شائع ہوں وہ مبتدی ہی ہوتا ہے۔ میری بھی ایسی ہی حالت تھی۔ آج تک میں اپنی تعریف ہی سنتا آیا تھا۔ میرے کان داد اور حوصلہ افزائی کے الفاظ ہی سے آشنا تھے۔ مخالف تنقید سننے کی استعداد شاید مجھ میں ابھی پیدا نہ ہوئی تھی۔

راستے بھر میں مس کیلاش کی تنقید کا جواب سوچتا آیا۔ دل ہی دل میں میں نے اپنی نظم کے کئی معانی نکالے۔ اس کی تنقید کو فضول اور بے معنی ثابت کیا۔ جب گھر پہنچا تو دماغ جل رہا تھا۔ نظموں کا مسودہ میں نے ایک طرف اٹھا کر رکھ دیا۔ اور مس کیلاش کو خط لکھنے میں منہمک ہو گیا۔ بہت دیر تک لکھتا رہا۔ ختم کیا تو معلوم ہوا پندرہ صفحے لکھ چکا ہوں۔ اس خط میں سب سے پہلے میں نے شاعری کی تعریف کی۔ انگریز شعرا کے حوالے سے بتایا شاعری کسے کہتے ہیں۔ اسے سمجھنے کیلئے جس چیز کی ضرورت ہے اس کا ذکر کیا۔ نظم کے جو معانی اس نے لئے تھے انھیں رد کیا۔ وضاحت کے ساتھ اپنی نظم کی خوبیاں بیان کیں۔ اور بتایا کہ اس نے نظم کو بالکل نہیں سمجھا۔ غم و غصّہ اور طنز سے یہ خط پُر تھا۔ آج اس بات کو یاد کرتا ہوں تو اپنی حماقت پر ہنسی آتی ہے لیکن اس وقت میں اپنے کام کی نوعیت۔ اس کی بھلائی برائی کے متعلق سوچ ہی نہ سکتا تھا۔ جذبات نے مجھ سے جو لکھایا لکھ دیا۔ دوبارہ خط پڑھا تو کئی جگہ تبدیلی کرنے کا خیال آیا لیکن پھر اسی طرح رہنے دیا۔ پہلے سوچا۔ نیچے اپنا نام نہ لکھوں لیکن پھر کسی فوری جذبے سے متاثر ہو کر اپنا نام اور پورا پتہ لکھ دیا۔

(۴)

کئی دن گذر گئے۔ میں بلا ناغہ دفتر سے آکر ڈاک دیکھتا لیکن مایوس ہو جاتا کہ اس نے میرے خط کا جواب ہی نہیں دیا تھا۔ مجھے رنج ہوا۔ ایک دو دفعہ مشن کالج کے

سامنے سے بھی گذرا لیکن اس سے دل کو تسکین نہ ہوئی۔ بارہا سوچا۔ مجھے جواب کی تمنا ہی کیوں ہے۔ اس کے خط کا جواب دینا تھا دیدیا۔ اب وہ جواب دے یا نہ دے لیکن پھر خیال آتا وہ ضرور جواب دے گی۔ میرا خط کتنا سخت تھا۔ پڑھ کر تڑپ اٹھی ہوگی۔ دفتر جاتے ہوئے ایک بار لیٹر بکس پر نگاہ ڈالتا مگر وہ خالی ہوتا۔

"دیا سنسار" کا اکتوبر نمبر شائع ہوگیا۔ اس میں اپنی بات کے نام سے ویاس جی شذرات لکھا کرتے تھے۔ میں نے سب سے پہلے اسی کو دیکھا۔ ویاس جی نے مس کیلاش کے خط کا جواب دیدیا تھا۔ نہایت مہذبانہ جواب لکھا تھا۔ لکھا تھا:

"۔۔۔۔ ہم نے نظم زیر بحث کو کئی مرتبہ پڑھا ہے۔ اور ہم اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ ہماری بہن نے اس کے سمجھنے میں غلطی کی ہے۔ اس نظم میں مصنف نے مردوں پر واضح کیا ہے کہ اگر تم عورت کی طرف سے بے پروا ہوگے تو عورت بھی تم سے انتقام لینے کو کھڑی ہو جائیگی۔ اور جس طرح وہ روتی ہے اسی طرح تم بھی اپنی غفلتوں کا ماتم کروگے۔ یہ نظم انھیں دونوں شانوں سے پکڑ کر جھنجوڑتی ہے۔ اور ان کو راہ راست پر چلنے کیلئے مجبور کرتی ہے۔ اب بتائیے یہ نظم ہندوستانی عورت کی توہین ہے یا نسوانی دنیا کی خدمت"

میں نے اسے دو تین دفعہ پڑھا لیکن اس سے میری تسلی نہ ہوئی۔ اسی موضوع پر میں نے ایک اور نظم لکھی اور اسے "چندن" کے نظم نمبر میں دے دیا۔"

بلونت بات کو درمیان میں ہی چھوڑ کر ایک کونے میں گیا۔ اور وہاں رکھی ہوئی الماری میں کوئی چیز ڈھونڈھنے لگا۔ لیکن پانچ چھ منٹ بعد ہاتھوں کی مٹی جھاڑتا ہوا واپس آیا۔

"کیا تھا؟" میں نے پوچھا۔

"میں یہ دیکھنے گیا تھا شاید کوئی نظم نمبر کا نسخہ یہاں ہو لیکن اب یاد آتا ہے کہ اسے تو جلا چکا ہوں۔ کتنا شاندار نمبر تھا۔ اس سال جتنے خاص نمبر نکلے تھے ان میں سب سے بڑھ گئے

سبقت لے گیا تھا۔ اس میں سب سے پہلے میری نظم تھی۔ مجھے اس کی تعریف میں کئی خط موصول ہوئے لیکن مجھے ان کی تمنا نہ تھی۔ میں سمندر کے پانی سے اس رتن کو نکالنا چاہتا تھا جو آسانی سے ہاتھ آنے والا نہ تھا۔

میں نے اس نمبر کی ایک کاپی مس کیلاش کے نام بھجوا دی۔ اور احتیاطاً اس کی ایک کاپی خود بھی ایک لفافہ میں بند کر کے اپنا پتہ لکھے بغیر اس کے نام ارسال کر دی لیکن کوئی جواب نہ آیا۔ مجھے جنون سا ہو گیا۔ میں نے تمام تعریفی خط جلا ڈالے۔"

ایک لمحہ کیلئے بلونت خاموش ہو گیا۔ پھر بولا: "ان تمام خطوں کے مقابلہ میں مس کیلاش کا خط کتنا زیادہ قیمتی ہوتا۔ سمجھو! لیکن اس کا جواب نہ آنا تھا نہ آیا۔ اس کے بعد میں نے اپنی نظموں کے کٹنگ لفافوں میں بند کئے اور انھیں اس کے نام پر بھیج دیا۔ اور پھر کئی روز تک میں تصوّر ہی میں کسی حسین ــ نازنین کو کوستا رہا۔ میرے دل میں، دل کی تمام امیدوں میں ایک تصویر سما گئی تھی۔ لیکن میں نے اسے ایک بار بھی دیکھا نہ تھا۔"

بلونت پھر میز پر بیٹھ گیا اور بولا:۔

"ایک دن صبح کا وقت تھا۔ میں ورزش کر رہا تھا۔ سردیوں کے دن تھے اور میں اندر کمرے ہی میں ہاتھ پاؤں ہلا لیا کرتا تھا کہ کسی نے دروازے پر دستک دی۔ میں نے اسپرنگ الماری میں رکھ دیئے اور کہا: "آ جائیے!"

دروازہ ایک حسینہ نے کھولا۔ میں ٹھٹک گیا۔

"میرا نام کیلاش بھنڈاری ہے!"

میں گویا زمین میں گڑ گیا۔ اپنی تمام طاقتوں کو جمع کر کے میں نے کہا: "تشریف رکھئے!" اور دوسرے کمرے میں بھاگ گیا۔ جلدی جلدی کپڑے پہن کر اور بالوں کو درست کر کے باہر آیا۔ آخر ملے بھی تو کس ہیئت کذائی میں۔ اور آ کر اس کے سامنے کرسی پر بیٹھ گیا۔

"مجھے آپ کے درشنوں کی بڑی خواہش تھی!" اس نے مسکراتے ہوئے کہا: "ایسا

لئے آج چلی آئی "

میں کیا جواب دیتا۔ وہ بولی :-

"آپ ایسی اچھی نظمیں کہتے ہیں اس کا مجھے خواب میں بھی خیال نہ تھا۔ شاعر تو قدرت کی سب سے بیش بہا سب سے خوبصورت چیز ہے۔ اور میں بیوقوف ہوں میں نے آپ کی شان میں گستاخانہ کلمات لکھ دیئے۔ کیا بتاؤں . . ."

دل کی خوشی کو دل ہی میں دبا کر میں نے کہا "ذرہ نوازی رہنے دیجئے میں آپ کی ذہانت کی داد دیتا ہوں۔ اس نظم میں واقعی نقائص تھے۔ دراصل مرد کیلئے کسی عورت کے جذبات کو قلبی جامہ پہنانا اور ان کی صحیح تصویر کھینچنا مشکل ہی نہیں ناممکن بھی ہے۔ میں احمق ہوں کہ میں نے یہ کوشش کی "

اس نے کہا "آپ مجھے شرمندہ کر رہے ہیں۔ میں نے اس نظم کو صرف سرسری نظر سے دیکھا تھا۔ ویاس جی کے جواب کے بعد اسے دو تین بار پڑھا تو اپنی غلطی کا احساس ہو گیا۔ جو کچھ ہے اسی کی تصویر کھینچنا ہی تو مصوّر کا کام نہیں۔ جو کچھ ہوتا ہے جس منظر کو مصوّر تصور میں دیکھتا ہے اسے بھی تو صفحۂ قرطاس پر لا سکتا ہے۔ شاعر بھی مصوّر ہی ہے۔ ایک قدرت کے مناظر کی تصویر کھینچتا ہے۔ دوسرا اول کے جذبات کی۔ ایک چاہتا ہے ایسا منظر ہوتا تو کیسا تھا۔ دوسرا چاہتا ہے ایسے جذبات ہوتے تو کتنا اچھا ہو۔ آپ نے بھی عورت کو جس روپ میں کھینچا وہ حقیقت سے چاہے بعید ہو لیکن موجودہ زمانہ میں اسی روپ کی ضرورت ہے "

میں گویا آسمان میں اڑا جا رہا تھا۔ کچھ کہنا چاہتا تھا لیکن الفاظ نہ ملتے تھے۔ جذبات آتے تھے پر گلے تک آ کر واپس ہو جاتے تھے۔ میں نے اسے ایک معمولی کالج اسٹوڈنٹ سمجھ لیا تھا۔ لیکن اب معلوم ہوا اس کی نگاہ کتنی باریک بیں، کتنی گہری تھی۔

وہ بولی "چاہتی تھی اپنے الفاظ کیلئے آپ سے معافی مانگوں۔ خط لکھنے کا ارادہ تھا۔

لیکن پھر سوچا کہ کیوں نہ جا کر خود ہی مل لوں۔ اسی لئے آج آگئی ہوں! امید ہے آپ مجھے معاف کر دیں گے۔"

میں بے حد خفیف ہوا۔ شاید ندامت میرے منہ پر جھلک اٹھی۔ آج تک میں نے اپنے آپ کو اتنا حقیر اتنا کمینہ کبھی خیال نہ کیا تھا۔ میں نے کہا۔

"آپ اس بات کا ذکر جانے دیں۔ انسان میں کمزوریاں ہوتی ہیں اور میں بھی ایک کمزور انسان ہوں، شاعر ہوں، داد کا خواہش مند ہوں۔ چاہتا ہوں شہرت ہو۔ اور ایسی شہرت ہو جس کے خلاف ایک آواز بھی نہ اٹھے۔"

وہ صرف مسکرائی۔ میں بھی مسکرایا اور پھر اس نے گفتگو کا موضوع بدل دیا۔ اس کی گہری نگاہوں نے جان لیا اس سے مجھے تکلیف ہوتی ہے۔ اور مجھ سے ایک دو نظمیں سنانے کی فرمائش کی۔ میں نے اپنی ایک غیر مطبوعہ نظم سنائی۔ سن کر وہ پھڑک اٹھی۔ میں نظم پڑھ رہا تھا اور وہ گویا سراپا گوش بنی سن رہی تھی۔ دل میں تمنا تھی کہ تاقیامت اسی طرح بیٹھے رہیں۔

(۵)

اس دن میں کوئی کام نہ کر سکا۔ میرے تصوّر کی تصویر سے وہ کتنی حسین تھی۔ کتنی جمیل۔ یہی سوچتا رہا۔ اس دن میں دفتر بھی نہ گیا۔ اتنی خوشی اتنی مسرت ہو رہی تھی کہ بیان نہیں کر سکتا۔

دوسرے دن وہ پھر آئی اور پھر گاہے گاہے آتی رہی۔ کبھی کبھی خود بھی نظمیں لکھ لاتی۔ کہتی "بلونت جی! تم مجھے شاعر بنا دو گے"! میں مسرت کے سمندر میں گم ہو جاتا اور کہتا "کیلاش تم فطری شاعر ہو"! اس کی طرف سے جواب ہمیشہ ایک ہلکی سی مسکراہٹ میں دیدیا جاتا۔

ہم دونوں لاہور کے باغوں۔ سڑکوں اور بازاروں کی سیر کرتے، دریا پر جاتے

ناؤ میں بیٹھ کر پار نکل جاتے جہاں ہماری خلوت میں کوئی حائل نہ ہوتا۔ دریا اپنی خاموش رفتار میں بہتا۔ بعض اوقات ہم زور زور سے باتیں کرتے تو دریا کی لہریں رقص کرنے لگتیں۔ کبھی ہم چُپ ہو جاتے تو معلوم ہوتا جیسے دریا نے بھی خاموشی اختیار کر لی ہے۔

وہی باغ جہاں میں نے ایک سال سے قدم نہیں رکھا تھا اب پھر خوشنما معلوم ہونے لگے۔ وہی بازار جو کچھ عرصے سے میرے لئے بے رونق تھے اب پھر دلچسپی کا سامان بن گئے۔ انسان کا دل سورج مکھی کا پھول ہے۔ محبت کے آفتاب کی روشنی سے کھل اٹھتا ہے۔ جدائی کی تاریکی اس کی زندگی کو فنا کر دیتی ہے۔ مجھے بھی ہر طرف نئی زندگی نئی روشنی کا احساس ہونے لگا۔ اور میں اس جدید زندگی میں کھو کر رہ گیا۔ نظموں کے مسودے پر الماری میں پڑے پڑے گرد کی تہ جم گئی۔

(۶)

اس عرصے میں سروپ نے اپنی نظموں کی کتاب شائع کی۔ ہمارے اخبار میں بھی تبصرے کی غرض سے آئی۔ میرے دل کو دھکا لگا۔ مجھے بھی اپنی نظموں کا خیال آگیا۔ جو الماری کے کسی کونے میں گمنامی کی حالت میں پڑی تھیں۔ میں نے کتاب کو ایک سرسری نظر سے دیکھا۔ تام تھا ’بکھرے موتی‘؛ سب مطبوعہ تھیں۔ میری غیر مطبوعہ نظمیں اُن سے کہیں زیادہ بلند تھیں۔ میں نے کتاب کو نفرت سے رکھ دیا اور گھر چلا آیا۔ شام کا وقت تھا۔ میں نے الماری سے نظموں کے مسودے اٹھائے۔ انھیں جھاڑا۔ پھر خود ہی ایک دو نظمیں پڑھیں۔ رگ رگ میں ایک نشہ سا چھا گیا۔ کیلاش نے مجھ سے کئی مرتبہ کہا تھا کہ تم بھی اپنی کتاب شائع کروا دو۔ دراصل شاعر تو اسی وقت سمجھا جاتا ہے جب اس کی کوئی کتاب چھپ جاتی ہے۔ لیکن میں اتنے دنوں کسی اور ہی دُنیا کی سیر کرتا رہا تھا۔ آج میں نے فیصلہ کر لیا انھیں ضرور پریس میں دے آؤں گا۔ خرچ ہی ہے نہ کسی نہ کسی طرح انتظام ہو ہی جائیگا۔ کوئی ٹیکسٹ بک ہوتی تو بیس پبلشر نکل آتے لیکن

ابھی تک ہندوستان میں شعرا کی دماغی کاوشوں کی قدر کرنے والوں کی کمی ہے میں نے مسودے کو بغل میں دبایا۔ دروازہ بند کرکے نکل ہی رہا تھا کہ کیلاش آ گئی۔

"سیر کو چلو گے؟" اس نے مسکرانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔

میں نے دیکھا اس کے چہرے پر پُرانی مسرت نہ تھی غم کا ایک ہلکا سا سایہ مجھے صاف نظر آیا۔ شاید اس کی طبیعت خراب تھی۔ یا شاید اس کا دماغ کسی فکر کی آماجگاہ بنا ہوا تھا۔ میں نے کہا "میں ذرا کام سے جا رہا تھا لیکن تمہارا چہرہ آج کیسا ہو رہا ہے؟ کوئی خاص بات تو نہیں؟"

"نہیں بالکل نہیں" یونہی ذرا طبیعت سارا دن کچھ بھاری بھاری رہی اس لئے میں جلدی آ گئی کہ چلو ذرا سیر کر آئیں۔ لیکن جب آپ کام کو جا رہے ہیں تو خیر میں پھر آ جاؤں گی!"

"نہیں، نہیں!" میں نے کہا "کوئی ایسا ضروری کام نہیں۔ ذرا یہ نظموں کے مسودے پریس میں دینے جا رہا تھا۔ پھر دے آؤں گا"

وہ ذرا چونکی۔ پھر اس نے کہا "نہیں نہیں یہ کام بے حد ضروری ہے میرا کیا ہے۔ میں تو پھر آ سکتی ہوں"

میں نے کنڈی کھول کر مسودوں کو اندر میز پر پٹکتے ہوئے کہا "یہ بھی پھر دیئے جا سکتے ہیں"

وہ میرے پیچھے پیچھے آ گئی۔ اس کے ہاتھ میں ایک کتاب تھی۔ میں نے کہا "یہ کیا ہے؟"

"سروپ نے اپنی نظموں کو شائع کیا ہے۔ یہ کتاب اس نے مجھے دی تھی کہ آپ تک پہنچا دوں سو لے آئی ہوں۔ کتاب تو اس نے چھاپ دی ہے مگر نظمیں کچھ یونہی سی ہیں۔ مجھے تو ایک بھی پسند نہیں۔ اس نے یونہی اس کا نام "بکھرے موتی" رکھ دیا۔ اس کا نام

تو بکھرے کنکر، ہونا چاہیئے تھا۔"

"اچھی نظمیں ہیں مجھے تو پسند ہیں۔"

"ہاں آپ کو ہوں گی مجھے تو نہیں۔ آپ بھی اپنی نظمیں کتابی صورت میں چھپوا لیجئے تو اسے معلوم تو ہو جاتا کہ شاعری کس چیز کا نام ہے۔"

"میری نظمیں بھی ایسی ہی ہیں۔"

"ان کا اور اُن کا کیا مقابلہ۔" اس نے ٹہلتے ہوئے کہا "کمبخت کوئی آپ سے سیکھ جائے اور ان حضرت کو دیکھو کہ دیباچہ ہی ۵ صفحے کا لکھ مارا ہے۔ جیسے کتاب کو دیباچہ کے بل ہی پر تو لے جائیں گے۔ میں تو لاتی ہی نہ تھی۔ مگر آپ کو دکھانے کے خیال سے لے آئی تھی۔"

اس کے بعد اس نے ایک قہقہہ لگایا۔ اس وقت اس کے جسم کی تمام سُرخی اس کے رُخساروں میں کھنچ آئی۔ اس کی تمام بیباکی ان خوبصورت بالوں کی لٹوں میں بھر گئی۔ جو اس کی کشادہ پیشانی پر ادھر اُدھر لہرا رہے تھے۔ میں نے کہا "اس تکلیف کیلئے شکریہ" اور پھر اوورکوٹ لینے چلا گیا۔

(۷)

باغ میں پہنچ کر ہم سبزہ زار پر نہیں بیٹھے۔ روش روش ٹہلنے لگے۔ بہار کی آمد آمد تھی۔ اس نے سبزہ پر جادو کر دیا تھا۔ مجھ پر دونوں طرف سے سحر چھڑکا جا رہا تھا۔ ایک وارفتگی کے عالم میں اس کے ساتھ سیر کرتا رہا۔ اس کی اُداسی نہ جانے کہاں غائب ہو گئی اور اس کی جگہ مسرت اور خوشی نے لے لی۔ "اس دن سمجھو!" بلونت نے میرے کندھے کو تھپکتے ہوئے کہا "اس پر غضب کی پھبن تھی۔ اس دن وہ معمول سے زیادہ ہنسی۔ ضرورت سے زیادہ مسکرائی۔"

مجھے محسوس ہوا بلونت مسرت سے نہایا انتہائی جلن سے باتیں کر رہا ہے۔

سلسلۂ کلام جاری رکھتے ہوئے اس نے کہا "اس دن میں اپنے آپ کو خوش قسمت سمجھتا تھا۔ کہاں وہ اور کہاں میں۔ جب اس کا اور اپنا مقابلہ کرتا تو اپنے آپ کو ہیچ سمجھتا۔ اس دن پہلی دفعہ مجھے محسوس ہوا کہ اگر کیلاش کو مجھ سے چھین لیا جائے تو میں زندہ نہ رہ سکوں گا۔ پہلی دفعہ مجھے یہ خیال آیا کہ میں اُس سے اپنی محبت کا اظہار کر دوں۔ اس کے سامنے دل کھول کر رکھ دوں۔ ہم دوسرے تیسرے دن سیر کو جایا کرتے تھے۔ لیکن ہماری گفتگو کا موضوع اِدھر اُدھر کی باتیں ہوتی تھیں۔ دلوں کے جذبات دلوں میں ہی دبے رہتے تھے۔ اس دن میں نے سوچا۔

بلونت کی آواز اونچی ہوتی گئی۔

"کہ اس سے محبت کا وعدہ لے لوں۔ اس سے کہہ دوں کیلاش تمہارے بغیر زندگی بیکار ہو جائے گی۔ جی نہ سکوں گا۔ لیکن جب بھی میں نے کوشش کی۔ صرف مدّعا زبان پر آ کر رہ گیا۔

تقریباً دو گھنٹے سیر کر کے ہم پلٹے۔ بسنت روڈ پر جدا ہوتے وقت میں نے اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال دیں۔ لیکن اس کے دل کی گہرائی تک رسائی نہ ہوئی۔ اس کی آنکھوں میں شوخی تھی۔ مسرت تھی۔ حد سے زیادہ مسرت تھی۔ لیکن کیا اس کے دل میں بھی وہی جذبات تھے جو میرے دل میں تھے؟ اس بات کا فیصلہ میں نہ کر سکا۔

وہ اپنے گھر کی طرف چلی گئی۔ میں اپنے گھر کی طرف آ گیا۔ راستے بھر کیا سوچتا رہا معلوم نہیں۔ جب گھر پہنچا تو نو بجے تھے۔ میں نے دروازہ کھولا۔ بٹن دبایا۔ میز پر نگاہ ڈالی وہاں نظموں کے مسودے نہیں تھے۔ الماری میں دیکھا وہاں بھی نہ تھے۔ ایک لمحہ کیلئے میرے تمام ولولے ہوا ہو گئے۔ سر چکرانے لگا۔ شبہ گذرا کہیں کسی نے چرا نہ لئے ہوں لیکن چرانے کس نے۔ باہر تو قفل پڑا تھا۔ میں نے پھر ایک دفعہ اِدھر اُدھر تلاش کی لیکن فراغ آنکھوں

کی مدد نہ کرتا تھا۔ تلاش بے سود ثابت ہوئی۔ مسودے نہ ملے۔ مایوس ہو کر آرام کرسی پر بیٹھ گیا۔"

"شمبھو!" بلونت نے نہایت بے چینی سے ٹہلتے ہوئے کہا۔ "اگر اُمید نہ ہو تو انسان ایک لمحہ نہ جی سکے۔ اگر مجھے معلوم ہو جاتا کہ مسودے گم ہو گئے ہیں۔ تو میں شاید اٹھ بھی نہ سکتا لیکن امید دوسری زندگی ہے۔ میں پھر تلاش کرنے لگا۔ اس دفعہ یکسوئی سے ہر جگہ دیکھ ڈالی لیکن ناکام رہا۔ خیال آیا کہیں اوور کوٹ کی جیب میں نہ ہو۔ یہ سوچتے ہی دروازہ بند کئے بغیر باغ کی طرف بھاگا۔ خاکی کاغذ پر لکھی ہوئی نظمیں آنکھوں کے سامنے چکر لگا رہی تھیں جیس طرح مجھ سے ہو سکا میں نے ان تمام مقامات کو دیکھا جہاں جہاں ہم گئے تھے لیکن رات کا وقت تھا۔ اور ویسے بھی میں تیزی سے دیکھ رہا تھا۔ اگر مسودے وہاں ہوتے تب بھی ممکن ہے نظر نہ آتے۔ میں ناکام واپس پھرا۔

نسبت روڈ کے قریب پہنچا تو خیال آیا چلو کیلاش کو بھی یہ خبر سنا آؤں۔ کم از کم دل کا غبار تو ہلکا ہو جائے۔ تین برس کی محنت اور یوں رائیگاں ہو جائے۔ لوگ اپنی نظمیں یاد کر لیتے ہیں۔ بدقسمتی سے مجھے ایک بھی یاد نہ تھی۔ کہانی ہوتی تو پھر بھی لکھی جا سکتی تھی۔ لیکن کہانی لکھنا اور نظم کہنا ایک جیسا نہیں۔ اگر ایک دفعہ خیال دماغ سے اُتر گیا تو پھر ہزار کاوش اور ہزار محنت سے بھی لکھنا ناممکن ہے! میں اپنی بے پروائی کو کوس رہا تھا۔ کتنی بار کیلاش نے کہا تھا . . . نظموں کو حفاظت سے رکھو۔ شاعر کی پونجی اس کی بیش قیمت نظمیں ہوتی ہیں۔ لیکن میری عقل پر پتھر پڑے ہوئے تھے میں نے کبھی پروا نہ کی۔

چھوٹے سے باغیچہ سے گذر کر میں برآمدہ کی سیڑھیاں چڑھنے لگا۔ پھر گیلری میں داخل ہوا۔ کیلاش کے کمرے میں بجلی جل رہی تھی۔ دروازہ پر چق پڑی ہوئی تھی۔ اندر سے باتیں کی آواز آئی۔ میں اندر جانے ہی لگا تھا کہ ٹھٹھک گیا۔ کمرے میں وہ اور سروپ آمنے سامنے کرسیوں پر بیٹھے تھے۔ رات کے وقت سردی اور زیادہ ہو گئی تھی۔ انگیٹھی میں کوئلے دہک

رہے تھے۔ اور وہ کیا کر رہے تھے جانتے ہو شیخ مو! میں نے وہاں کیا دیکھا؟ جان سکتے ہو؟"

۔۔۔۔ میں نے دیکھا کیلاش ہنس ہنس کر ایک ایک نظم سروپ کو دکھاتی ہے اور پھر اُسے پُرزے پُرزے کر کے کوئلوں کی نذر کر رہی ہے۔ وہ تیسے ذبح کر رہے تھے میرے دل کے ٹکڑوں کو سپردِ آتش کر رہے تھے۔ اور میں کھڑا دیکھ رہا تھا"

بلونت بہت زور زور سے بول رہا تھا۔ لیکن ایک دم اس کی آواز دھیمی ہو گئی بولا۔

"میں نے آنکھوں کو ملا۔ یہ خواب نہ تھا حقیقت تھی۔ خوفناک اور تلخ حقیقت!

میری عزیز نظمیں جل رہی تھیں اور میں کھڑا دیکھتا تھا۔ اس نے اور بھی مری ہوئی آواز میں کہا۔ میرے پاؤں کی طاقت سلب ہو چکی تھی۔ میرے جسم میں اتنی بھی طاقت نہ تھی کہ بڑھ کر اس کے ہاتھ سے باقی اوراق چھین لوں اور باقی نظموں کو ضائع ہونے سے بچا لوں۔ میرا سر گھوم رہا تھا۔ آنکھوں کے آگے تاریکی چھا رہی تھی۔ میں بے ہوش ہونے کو تھا کہ سروپ نے کہا 'ہٹاؤ جی' اور ایک بار ہی سب کاغذوں کو آگ کی نذر کر کے اسے آغوش میں لے لیا۔

اس کے چہرے کی طرف کیلاش نے دیکھتے ہوئے کہا "سروپ! اب بھی تم مجھ پر شک کرو گے؟"

اور اس کے جواب میں سروپ نے اسے اپنے سینے سے لگا لیا۔

میری بیہوشی کافور ہو گئی۔ میری آنکھوں میں خون اتر آیا۔ انتقام کے تمام جذبات مشتعل ہو گئے"

بلونت نے میرے کندھے جھنجوڑتے ہوئے کہا۔ لیکن پھر اس کی آواز دھیمی ہو گئی اور نہایت آہستہ سے اس نے کہا۔

لیکن شمبھو میری نظروں میں میرا بدصورت چہرہ بگڑ گیا۔ غصہ کی بجائے دل ہی دل میں ہنسا اور اُلٹے پاؤں چپکے سے واپس پھرا۔ اور اسی رات لاہور سے چلا آیا۔"

ایک لمحہ کیلئے کمرے میں سناٹا رہا۔ میں نے بلونت کے جھکے سے پھرے ہوئے چہرے کی طرف دیکھا جو موت کی طرح سیاہ ہو گیا تھا۔ پھر برج کی طرف دیکھا۔ وہ خاموش بیٹھا تھا۔ گویا اس کی زبان گنگ ہو گئی ہے۔۔

اچانک بلونت نے ایک گہرا لمبا سانس لیا۔ اس کی نگاہ گھڑی پر گئی اور وہ چونک اٹھا۔

"اچھا آداب عرض"، اس نے ہاتھ بڑھاتے ہوئے کہا "وقت زیادہ ہو گیا ہے پھر کسی وقت ملیں گے"

ہم دونوں خاموشی سے اُٹھے اور اس سے ہاتھ ملا کر بینک سے باہر نکل آئے۔ میں نے جاتے جاتے مڑ کر دیکھا

وہ اسٹول پر بیٹھا اسی طرح سر جھکائے کام میں مشغول تھا۔

مایا

"یہ بھی کوئی بات ہے" — لالہ پنج بھان بولے — "میں ایک حسینہ سے صرف دس منٹ کیلئے ملا۔ لیکن آج تک اس کی یاد کو دل سے فراموش نہیں کر سکا۔ کون کہہ سکتا ہے — میں اس سے محبت نہیں کرتا۔ پھر یہ کس طرح ممکن ہے محبت تبھی بڑھتی ہے جب میل جول بڑھتا ہے۔ میں کہتا ہوں محبت کے بازار میں ملاقاتوں کی اتنی قیمت نہیں جتنی دل کی ہے۔ میں اُن چند لمحوں کی یاد کو آج بھی کنجوس کے دھن کی طرح سینے میں چھپائے ہوئے ہوں۔ اور کون جانتا ہے وہ بھی ایسا ہی ترستی ہوگی؟"

وسنت بولے "صرف دس منٹ ہی!"

"بلکہ اس سے بھی کچھ کم!" — لالہ جی نے کہا، اور پھر بولے:-

"یہ ۱۹۲۹ء کی بات ہے۔ ان دنوں لاہور میں کانگریس کے اجلاس کی دھوم دھام تھی تمہیں یاد ہوگا۔ کانگریس کی کارروائی کے شروع ہونے سے کچھ دن پہلے بارش ہوئی تھی۔ بس اسی دن کا ذکر ہے۔ میری کار ہوا سے باتیں کرتی ہوئی منٹو پارک والی سڑک پر سے اڑی ہوئی جا رہی تھی کہ جھپاکے کے ساتھ بارش آگئی اور دیکھتے دیکھتے زور کا مینہ برسنے لگا۔ میں سیٹ میں پیچھے کی طرف لیٹا ہوا تھا۔ نہ جانے کیا سوچ رہا تھا کہ ایک دم کار رک گئی۔ میں آگے کو گرا۔ ذرا بیزاری سے میں نے ڈرائیور کی طرف دیکھا اور پوچھا "کیا بات ہے؟"

لیکن اس سے پیشتر کہ وہ جواب دیتا کار کی دائیں کھڑکی کے پاس ایک خوبصورت نازک اندام حسینہ آکر کھڑی ہوگئی۔ ہوا سے اس کی ساڑھی سر سے اڑی جا رہی تھی اور وہ بار بار اسے سر پر اوڑھنے کی ناکام کوشش کرتی تھی۔ میں نے بسرعت تمام کھڑکی کا شیشہ نیچے کیا۔ شاید ڈرائیور نے اسی کے اشارے پر کار روک لی تھی۔

ــــ "کیا آپ مجھے کانگریس نگر تک پہنچانے کی تکلیف کریں گے؟"

میں نے جواب دینے کی بجائے دروازہ کھول دیا۔ وہ بلا تکلف سیٹ پر آ بیٹھی۔ اور شیشہ چڑھاتے ہوئے بولی:۔

"بارش آئی بھی تو جھپاکے کے ساتھ"

مجھے جانا تو مال پر تھا۔ لیکن میں نے کہا ــــ "کوئی بات نہیں۔ میں بھی ادھر ہی جا رہا ہوں" وہ مسکرائی۔ میٹھی کیف زا مسکراہٹ! میں نے اس کی طرف دیکھا۔ اور اگرچہ آنکھ بھر کر نہ دیکھ سکا لیکن اتنا معلوم ہوا کہ وہ کسی اونچے گھرانے کی لڑکی ہے موٹروں میں بیٹھنا جانتی ہے۔ پڑھی ہوئی اور تربیت یافتہ ہے۔ کانگریس کے اجلاس میں شریک ہونے کی غرض سے آئی ہے۔ ابھی کچھ دیر پہلے رنجیت سنگھ کی سمادھ دیکھنے سہیلیوں کے ساتھ گئی تھی۔ وہ قلعہ دیکھنے چلی گئیں۔ اسے کام تھا اس لئے واپس چلی

کھڑی ہوئی۔ ابھی یہاں تک پہنچی تھی کہ بارش آگئی۔

میں نے اسے کانگریس نگر کے دروازہ پر اتار دیا۔ اب بارش ختم ہو گئی تھی۔ مختصر سا بادل تھا۔ جو کچھ لمحوں کیلئے آیا اور چلا گیا۔ میں بھی اس کے ساتھ ہی اُترا۔ اس نے کہا "میں کس طرح آپ کا شکریہ ادا کروں۔ اگر آپ کار کھڑی نہ کر لیتے تو میری کیا حالت ہوتی!"

میں نے ذرا ہنس کر کہا "نہیں نہیں، کوئی ایسی بات نہیں۔ مجھے بھی تو ادھر ہی آنا تھا"

"میں آپ کا یہ احسان کبھی نہ بھولوں گی" اور یہ کہہ کر وہ تیزی سے چلی گئی۔

میں کھویا سا کار میں آ بیٹھا۔ جب کار چلنے لگی تو میں نے دیکھا کہ جہاں وہ بیٹھی تھی وہاں کونے میں ایک خوبصورت رومال پڑا ہے ——— ٹھہرو! میں نے چیخ کر ڈرائیور سے کہا اور جھٹ سے دروازہ کھول کر اترا لیکن وہ دکھائی نہ دی۔ میں کچھ قدم آگے بڑھا، نہ جانے وہ کس طرف، کہاں مڑ کر آنکھوں سے اوجھل ہو گئی تھی۔ کچھ لمحے میں چپ چاپ کھڑا سوچتا رہا پھر رومال کو احتیاط سے تہ کر کے دونوں ہاتھوں میں دبائے واپس آ کر اپنی سیٹ پر بیٹھ گیا۔ ڈرائیور نے دروازہ بند کر دیا اور کار اسٹارٹ کر دی۔ تب تنہائی میں میرے دونوں ہاتھوں میں دبا ہوا رومال آہستہ آہستہ میرے ہونٹوں سے آ لگا۔ کار تیزی سے چلنے لگی ——— کانگریس نگر، اس کا شور و شغب، بھیڑ بھاڑ سب دور ہوتے گئے۔ موٹر گاڑیاں، چھکڑے، تانگے اور سڑک کے دو رویہ کھڑے درخت سب تیزی سے گزرتے گئے۔ کار میرے مکان کے پاس جھٹ سے آ کر رکی، تب میں محویت سے جاگا۔

اگرچہ اس واقعہ کو دس سال ہو گئے ہیں۔ لالہ رتن بھان نے لمبی سانس لیتے ہوئے کہا "لیکن میں اس کی یاد کو دل سے محو نہیں کر سکا۔ اور آج تک میں محسوس کرتا رہا ہوں کہ میں اس لڑکی سے محبت کرنے لگا تھا"

میں نے پوچھا "تو پھر اس سے تمھاری ملاقات نہیں ہوئی؟"

"جتنے دن کانگریس رہی وہاں جاتا رہا۔ لیکن شاید اس نے پھر وہ ساڑی ہی نہیں پہنی اور چونکہ میں پہلی بار اسے اچھی طرح دیکھنے کا حوصلہ نہ کر سکا تھا۔ اس لئے اگر وہ کہیں ہوگی بھی تو میں اسے پہچان نہیں سکا۔"

میں ہنسا۔ وسنت بولے ——— "تم نے رومال کی بات کہی تو مجھے بھی رومال کا ایک واقعہ یاد آگیا۔"

ہم اشتیاق سے کرسیوں پر ذرا آگے کو جھک گئے۔ نوکر سے میں نے چائے کے کپ وغیرہ اٹھا لے جانے کو کہا۔ دسمبر کا مہینہ تھا۔ کافی سردی پڑنے لگی تھی۔ اس دن آسمان پر کچھ بادل بھی چھائے ہوئے تھے۔ سامنے کھڑکیوں کے شیشوں سے دور تک چھائی ہوئی کالی گھٹا صاف دکھائی دے رہی تھی۔ شاید باہر ہوا بھی چل رہی تھی۔ ٹھنڈی اور تیر کی طرح چبھ جانے والی ——— لیکن کمرہ گرم تھا۔ انگیٹھی میں آگ جل رہی تھی۔ وسنت بولے ———

میری کہانی سیدھی سادی سی ہے۔ نہ تو اس کا آغاز اتنا رومان انگیز ہے اور نہ انجام۔ تم سب کو اچھی طرح معلوم ہے کہ میں ابتدا ہی سے کانگریسی ہوں۔ آج تو میں صوبجاتی اسمبلی کیلئے امیدوار ہوں لیکن لاہور کانگریس کے موقع پر میں ایک حقیر والنٹیر تھا۔ ہماری ڈیوٹیاں عموماً بدلتی رہا کرتی تھیں۔ اور بارہا ایسا ہوتا تھا کہ لیڈی والنٹیرز کی اور ہماری ڈیوٹیاں ایک ہی جگہ لگ جاتیں۔ مجھے ان میں سے ایک سے ذرا دلچسپی ہوگئی۔ گوری، نازک اور شوخ سی وہ لڑکی میری آنکھوں میں کھب گئی۔ اور میں اس سے باتیں کرنے کو بے چین ہوگیا۔ دن میں کئی بار ہمارا سامنا ہوتا اور وہ ایک بار میری طرف دیکھ کر تیزی سے نکل جاتی۔ لیکن باتیں کرنے کا موقع نہ ملتا۔ جب کانگریس کے اجلاس کی کارروائی باقاعدہ شروع ہوئی تو میں نے کوشش کرکے ہر اس جگہ ڈیوٹی لینا شروع کر دیا جہاں وہ ہوتی۔ ایک دن باتیں کرنے کا موقع بھی مل گیا۔ سبجیکٹ کمیٹی

کا اجلاس شروع ہونے والا تھا۔ پنڈال میں صرف لیڈی والنٹیروں کا پہرہ تھا۔ اندر کسی والنٹیر کو بھی نہ جانے دیا تھا۔ اس کی ڈیوٹی اندر کے گیٹ پر تھی۔ کارروائی شروع ہوگئی لیکن مجھے اندر جانے کا موقع نہ ملا۔ میں باہر کھڑا کافی دیر تک سوچتا رہا۔ میرے دیکھتے دیکھتے ایک اسکاؤٹ پانی کا گلاس لے کر اندر گیا اور پانی پلا کر آگیا۔ اسکاؤٹوں کا کام لیڈروں کو کھانا کھلانے تک محدود تھا۔ اور وہ اپنے کمشنر کے ماتحت کام کرتے تھے۔ کانگریسی والنٹیروں سے انھیں کوئی واسطہ نہ تھا۔ ان کو پنڈال کے اندر جاتے اور پھر آتے دیکھ کر مجھے ترکیب سوجھ گئی۔ میں لنگر خانہ سے ایک چھوٹی سی بالٹی اور گلاس لے آیا۔ نلکے سے اس میں تھوڑا سا پانی بھر لیا اور دور سے بھاگتا ہوا آیا۔ گیٹ پر لیڈی والنٹیروں کی کپتان خود ٹکٹ چیک کر رہی تھیں۔ ان کا دھیان دوسری طرف تھا۔ میں تیزی سے اُن کے پاس سے گذرا۔ انھوں نے روکا۔ میں نے پیچھے ایک طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ "وہ پانی مانگ رہے ہیں" اور رُکے بغیر بڑھ گیا۔ دکھانے کیلئے دو ایک وزیٹروں کو پانی پلاتے تھا۔ کپتان صاحبہ دوسرے آنے والوں کو چیک کرنے میں منہمک ہوگئیں۔

اس دوران میں ان دیوی جی کو بھی پیاس لگی۔ انھوں نے مسکرا کر پانی مانگا۔ میں نے گلاس بھر کے دے دیا۔ پی کر انھوں نے کہا "شکریہ!" میرے چہرے پر سُرخی دوڑ گئی۔ اور میں اس کو دیکھتا رہا۔ وقفے میں لوگ باہر جانے لگے۔ گیٹ پاس ختم ہوگئے۔ کپتان صاحبہ چلائیں۔ "مہربانی کر کے کچھ پاس لائیے" میں بھاگ کر اس کے پاس ہی گیا اور لکنت آمیز لہجے میں بولا "گیٹ پاس مانگے"۔ وہ مسکرائی اور دھیرے سے اس نے پاس میری طرف بڑھا دیئے۔ پاس لیتے وقت میرا ہاتھ اس کے ہاتھ سے چھو گیا۔ مجھے ایسا معلوم ہوا کہ ایک لمحہ کیلئے پاس اس نے اپنے ہاتھ میں روک رکھے۔ مجھے ایک غیر معمولی خوشی کا احساس ہوا۔ اور جیسے اُڑتا ہوا میں پاس لے آیا۔ شکریہ ادا کرنا بھی بھول گیا۔ پاس گیٹ پر دے کر میں پھر اس کے پاس گیا۔ اور میں نے آہستہ سے کہا "کپتان صاحبہ

آپ کا بہت شکریہ ادا کرتی ہیں"۔ وہ ہنس دی۔ میں بھی مسکراہٹ نہ روک سکا۔ آہستہ سے میں نے کہا "اور میں بھی"

"آپ کے شکریہ کی ضرورت نہیں"۔ اس نے منہ پھیر کر کہا۔ ہم دونوں مسکرا دئیے۔

اس طرح ہمارا تعارف ہوا۔ اور ہم میں ارتباط بڑھتا گیا۔ دن بھر میں ہم کسی نہ کسی طرح باتیں کرنے کا وقت نکال ہی لیتے۔ ان دنوں کی یاد آج بھی ایک ٹیس سی پیدا کر دیتی ہے۔ کانگریس کے اجلاس کے ایک ہفتہ گزرتے دیر لگی معلوم بھی نہ ہوا۔ اور دن بیت گئے۔ آخر وہ دن آ گیا جب ہمیں ایک دوسرے کو الوداع کہنا تھا۔ اسے اپنے دیس اور مجھے اپنے دیس ——— ہم دونوں دور راوی کے کنارے پر ملے۔ سردیوں میں سوکھی راوی جیسے اپنا سہاگ لٹا کر بیوگی کے دکھ میں لیٹی ہوئی تھی شام کا وقت تھا اور ایک اکھڑ سا اندھیرا سب طرف چھا رہا تھا۔

اس نے کہا ——— "راجی تم اپنا نام اور اتا پتا تو بتا جاؤ اور کچھ نہیں تو اپنی کوئی نشانی ہی دے جاؤ"

ایک اداس مسکراہٹ اس کے ہونٹوں پر چھا گئی۔ اس نے کہا "کمار بھول جاؤ۔ زندگی فانی ہے تو پھر محبت ہی کیوں امر رہے۔ اسے ہی کیوں حیات جاودانی حاصل ہو۔ اتا پتا۔ یہ بھی چھوٹی باتیں ہیں۔ دنیا میں کون اتا پتا لے کر آیا ہے اور کون اتا پتا بتا کر جائے گا سمجھ لینا۔ زندگی کی بہتی ہوئی ندی ایک لمحہ کیلئے رکی اور پھر اپنی روانی میں بہنے لگی" ——— یہ کہتے ہوئے اس نے مجھے ایک رومال دیا۔ اس پر انگریزی حروف میں لکھا ہوا تھا۔ فارگیٹ (بھول جاؤ) اور لیڈی والنٹیروں کے کیمپ سے سیٹی کی آواز آئی۔ اس کے لرزتے ہوئے لبوں سے نکلا ——— بھول جاؤ اور وہ ہاتھ جوڑ کر نمستے کہتی ہوئی مڑی اور چلی گئی۔ میں وہیں کھڑا رہا۔ جب وہ آنکھوں سے اوجھل ہو گئی تو میں نے دھڑکتے ہوئے دل کو روک کر رومال کو چوم لیا۔ اور آنکھوں سے ٹپکتے ہوئے آنسو دبا لیا

کی دو بوندوں کو پونچھ ڈالا۔

"اگرچہ اس نے کہا تھا بھول جاؤ! لیکن کیا میں بھول سکا ہوں؟"

یہ کہہ کر دوست کمار ایک سوکھی ہنسی ہنسے۔ لالہ جی بھالن نے کہا ۔۔۔ "واہ یار بھلا میرا رومال اس ٹریجیڈی کے مقابلہ میں کیا ٹھہرے گا!"

شرما جی پلنگ پر کمبل اوڑھے بڑے دھیان سے کہانی سن رہے تھے۔ ان کے چہرے سے ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے وہ بھی کچھ کہنا چاہتے ہیں یا یہ کہہ نہیں پا رہے تھے۔ میں نے ذرا ہنستے ہوئے کہا "کیوں شرما جی! آپ کے پاس بھی رومال کی کوئی کہانی ہے؟"

کچھ لجاتے اور کچھ شرماتے ہوئے شرما جی نے کہا ۔۔۔ "بھئی چاہے جو سمجھو لیکن میرے ساتھ بھی ایک ایسا ہی واقعہ ہوا اور وہ بھی کانگریس کے اسی اجلاس میں۔ اور چاہے تم یقین نہ کرو لیکن اس کو بھی رومال سے کچھ نہ کچھ تعلق ضرور ہے!"

شرما جی اٹھ بیٹھے۔ ہم سب ذرا چوکنے ہو کر بیٹھ گئے اور ان کی کہانی سننے لگے۔ انگیٹھی کو ذرا اپنا پائنتی کے نیچے سرکا لیا اور کندھوں تک کمبل اوڑھ کر شرما جی کہنے لگے ۔۔۔ تم جانتے ہو ہمارے لیڈروں نے زندگی کے تمام لطف پھیکے کر دیئے۔ کوئی رس ہی باقی نہیں رہنے دیا۔ لوگ لیڈروں کو تو پتھر کا بت دیکھنا چاہتے ہیں۔ ان سے ایسے چلن کی امید رکھی جاتی ہے جو فرشتوں کو بھی نصیب نہ ہو۔ پبلک اسٹیج پر آنے اور کامیابی حاصل کرنے کے لیے اسے بنائے رکھنے کے لئے دل کو قفل لگا کر رکھنا بے حد ضروری ہے اور میں نے ایسا کیا بھی ہے۔ اتنی عمر ہو گئی ہے۔ میں نے اسے قابو میں رکھا ہے۔ میں نے اسے پتھر ہی بنا لیا ہے۔ پھر بھی ایسے موقعے آ جاتے ہیں جب یہ موم ہو جاتا ہے اور اپنے استحکام کو چھوڑ دیتا ہے۔

کانگریس کا عام اجلاس ہو رہا تھا۔ اور میں استقبالیہ کمیٹی کے ممبروں میں بیٹھا تھا۔ جب میں نے دیکھا کہ ایک لڑکی ایک دو بار آئی کبھی اس لیڈر اور کبھی اس لیڈر کیلئے پنکھا لائی۔ میں اس کی چنچلتا، اس کی خوبصورتی کو دیکھ کر کچھ مبہوت سا رہ گیا۔ وہ شاید والنٹیر تھی اور دوسروں کی طرح اپنے کام میں منہمک تھی۔ لیکن اس کو کیا معلوم کہ اس کا یہ انہماک دوسروں کو کتنا محو کئے دیتا ہے۔ جب وہ چوتھی بار آئی تو میں نے اُسے بلایا اور اس سے کسی والنٹیر سے پانی لانے کیلئے کہنے کی درخواست کی۔ کسی دوسرے سے کہنے کی بجائے وہ خود ہی پانی لے آئی۔ پانی پیتے پیتے میں نے اس سے اس کے نام اور کیمپ وغیرہ کے بارے میں سب باتیں پوچھ لیں۔ گلاس لیکر وہ مسکراتی ہوئی چلی گئی۔ میں نے دیکھا کہ اس کی مسکراہٹ فطری تھی۔ اور وہ انجانے ہی دوسروں کو لبھا رہی تھی۔ اس کے بعد بھی اس کا میرا سامنا ہوا۔ جہاں بھی وہ ملی اس نے مسکرا کر نمستے کہی۔ جس دن پنڈت جواہر لال نہرو نے مکمل آزادی کے نصب العین کا اعلان کیا اس کے دوسرے دن کپتان صاحب نے ہمیں سب کیمپ دکھلائے۔ ہم اس کے کیمپ میں بھی گئے۔ اس وقت وہ اپنا اٹیچی کیس کھول کر کچھ ڈھونڈھ رہی تھی اور اس کے کاڑھے ہوئے رومال دری پر بکھر گئے تھے۔ ہمارے داخل ہوتے ہی اس نے نمستے کہی۔ میں نے پوچھا "یہ رومال تم نے ہی کاڑھے ہیں؟"

"جی" اس نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔

میں نے ایک رومال اٹھا لیا۔ ایک کونے میں لکھا ہوا تھا "بابا"۔ میں نے اُسے تہ کر کے جیب میں رکھتے ہوئے کہا "یہ تو آپ میں دے دو۔"

"آپ لے لیجئے"

اور ہم باہر آ گئے۔ میرے ساتھی لیڈر نے میرے کندھے کو تھپتھپاتے ہوئے کہا "کیوں بھئی!" لیکن میں اس وقت کسی دوسرے شخص سے ایک سیاسی معاملہ پر

اس جوش سے گفتگو کر رہا تھا کہ میرے پاس ان کی اس "کیوں بھی" کا جواب دینے کیلئے وقت نہ تھا۔

گھر آکر میں نے اس رومال کو پھر کھولا۔ دیکھا اور ایک لمبی سانس لیکر رکھ لیا۔ اس وقت پہلی بار میں نے چاہا ——— کاش میں لیڈر نہ ہوتا"

شرما جی کی کہانی کے بعد کچھ لمحوں کیلئے کمرہ میں خاموشی چھا گئی۔

تینوں شاید اسمبلی کے انتخابات کو بھول کر اپنی اپنی دنیا میں گم ہو گئے تھے۔ آخر میں نے اس خاموشی کو توڑتے ہوئے کہا۔

تو اس کا نام "بابا" تھا۔

دیکھ لو صاف لکھا ہے "شرما جی نے رومال نکال کر رکھ دیا"

ایک فوری جذبہ کے ماتحت لالہ تیج بھان اور مسٹر وسنت کمار نے بھی رومال نکالے ان دونوں کے کونوں میں بھی باریک سا "ما" بنا ہوا صاف نظر آ رہا تھا۔

تینوں لیڈروں نے کنکھیوں سے ایک دوسرے کو دیکھا اور پھر میری طرف دیکھکر مسکرا دیئے۔

اُبال

جب دودھ اُبل اُبل کر کوئلوں پر گرنے لگا اور شاں شاں کی آواز کے ساتھ ایک تیکھی سی بُو اٹھی تو چندن نے ہڑبڑا کر پتیلی کی طرف ہاتھ بڑھایا۔ کوئلوں کی تپش سے پتیلی سُرخ ہو رہی تھی۔ بے بسی کے انداز میں چندن نے جلد جلد اِدھر اُدھر دیکھا۔ کوئی کپڑا پاس نہ تھا۔ اس نے چاہا پانی کا چھینٹا ہی دیدے لیکن لوٹے کے پانی میں ابھی ابھی اس نے آٹے والے ہاتھ دھوئے تھے ——— دودھ اُبل رہا تھا اور جلے ہوئے جھاگ کی بُو کمرے میں پھیلنے لگی تھی۔ اندر اس کے مالک اور مالکن آہستہ آہستہ باتیں کر رہے تھے ——— بے بسی کے اس لمحہ میں چندن کے بڑھے ہوئے ہاتھ اور آگے بڑھ گئے۔ اور لحظہ بھر میں تپتی جلتی پتیلی کھٹ سے فرش پر آ گئی۔ چندن کی انگلیوں کی

پوریں جل گئیں۔ اور اُبلتا ہوا دودھ اس کے ہاتھوں پر گر گیا۔ اور جلن کی وجہ سے اس کے ہونٹوں سے بیساختہ ایک "سی" نکل گئی۔

پتیلی کو کھٹ سے فرش پر رکھتے ہوئے تھوڑا سا دودھ فرش پر بھی گر گیا تھا۔ اسی آٹے کے پانی سے اس نے اُسے دھو ڈالا اور انگلیوں کی جلن کو جیسے جھاڑ کر اتارتا ہوا وہ غسل خانہ کی طرف بھاگا۔

پانی کی دھار کے نیچے ہاتھ رکھے رکھے اس نے سر کو ہلکا سا جھٹکا دیا اور مسکرایا۔ جب بھی اس سے کوئی بیوقوفی سرزد ہو جاتی تھی وہ اسی طرح سر ہلا کر ہونٹوں کے بائیں کونے میں مسکرایا کرتا تھا۔ اور ہونٹ کٹے ہونے کے باعث اس کے دانت دکھائی دینے لگتے تھے۔

بات یوں ہوئی کہ دودھ کو انگیٹھی پر رکھ کر وہ اپنے مالک اور مالکن کی باتیں سننے میں محو ہو گیا تھا۔ اگرچہ دن کافی چڑھ آیا تھا اور چندن نے تو دوپہر کے کھانے کیلئے آٹا تک گوندھ لیا تھا لیکن وہ ابھی بستر میں ہی لیٹے ہوئے تھے۔ اور کچھ ہی دیر پہلے اس کے مالک نے وہیں سے چندن کو چائے بنانے کا حکم دیا تھا۔

اس نے دودھ کی پتیلی کو انگیٹھی پر رکھ دیا تھا۔ اور دروازہ کی طرف کان لگا کے اپنے مالک اور مالکن کی باتیں سننے لگا تھا۔ جب سے اس کے مالک کی شادی ہوئی تھی وہ دیر سے اٹھتا تھا۔ اس سے پہلے وہ علی الصبح اٹھنے کا عادی تھا۔ نور کے تڑکے اٹھ کر وہ چندن کو اٹھاتا، مالش کرواتا، ورزش کرتا، سیر کو بھی جاتا۔ لیکن اب وہ اپنی اس نئی بیوی کے ساتھ دن چڑھے تک سویا رہتا۔ اور جب جاگتا تو وہیں لیٹے لیٹے اسے چائے بنانے کا حکم دیدیا کرتا۔ چندن کو ان باتوں میں رس آنے لگا تھا۔ وہ بستر پر لیٹے آہستہ آہستہ باتیں کرتے رہتے۔ وہ بیٹھا انہیں سننے کی کوشش کیا کرتا۔

آنچ کی تیزی کے سبب دودھ پتیلی میں بے طرح ابل کھا رہا تھا۔ اور چندن اس

طرف سے بے خبر ہمہ تن گوش ہو کر اپنے مالک اور مالکن کی باتیں سننے کی کوشش میں مصروف تھا۔

"میں مجبور ہوں تمھارے گال ہی ایسے ہیں"
"آپ کے ہاتھوں کا بھلا کوئی قصور نہیں؟"
"اتنے اچھے ہیں تمھارے گال کہ . . ."
"جلنے لگے ہیں آپ کی چپتوں سے"
"لو میں انھیں ٹھنڈا کر دیتا ہوں"

اور چندن کو ایسا محسوس ہوا جیسے کوئی نرم و نازک پھول ریشم کے فرش پر چپا پڑا ہو۔ تصور ہی تصور میں اس نے دیکھا کہ اس کے مالک نے اپنے ہونٹ اپنی بیوی کے گالوں سے چپکا دیئے ہیں۔ وہیں بیٹھے بیٹھے اس کا جسم گرم ہونے لگا۔ اس کے اعضا تن گئے اور تصور ہی تصور میں اپنے مالک کی جگہ اس نے لے لی۔

ہاتھ دھو کر اس نے سر کو پھر جھٹکا دیا۔ اور ہونٹوں کے باہیں کونے سے مسکراتا ہوا وہ اندر گودام میں گیا۔ اس نے ذرا سا سرسوں کا تیل لیکر اپنے ہاتھوں کی جیلی ہوئی سیاہ جلتی ہوئی ہتھیلی پر اس جگہ لگایا جہاں جلن ہو رہی تھی۔ پھر جا کر وہ رسوئی میں بیٹھ گیا۔ اور اس نے چائے کی کیتلی انگیٹھی پر رکھ دی۔

لیکن ہاتھ جلانے اور اپنی اس محویت پر دو بار سر ہلانے کے باوجود اس کے کان پھر کمرے کی طرف لگ گئے۔ اور اس کا تصور اپنی تمام یکسوئی کے ساتھ اس کے سامعہ کی مدد پر ہو گیا۔ اور اس کی آنکھوں کے سامنے پھر کئی تصویریں بننے اور مٹنے لگیں۔

"چندن!" اس کے مالک نے چیخ کر آواز دی۔ اور پھر کہا "وہیں مر گئے کیا؟"

مالک کی آواز سن کر وہ چونکا۔ جلد جلد چائے اور ٹوسٹ تیار کر کے اندر لے گیا۔ اس

کے مالک اور مالکن حسب دستور بستر پر پڑے تھے۔ وہ دونوں ہم آغوش تو نہ تھے لیکن پھر بھی دونوں ایک دوسرے سے لگے تکیے کے سہارے لیٹے ہوئے تھے۔ لحاف ان دونوں کے سینے تک تھا۔ اور مالک کا بازو ابھی تک مالکن کی گردن کے نیچے تھا۔

"ادھر رکھ دو۔"

چندن نے تپائی پر ٹرے رکھ دی۔

ایک نظر دیکھ کر مالک نے کہا "مغیں ہو گیا گیا ہے۔ دودھ کا جگ کہاں ہے؟"

"جی ابھی لایا" اور سر کو ایک بار جھٹکا دے کر ہونٹوں کے بائیں کونے سے مسکراتا ہوا وہ رسوئی کی طرف بھاگا۔

دوسرے لمحے اس نے دودھ کا برتن لاکر رکھ دیا لیکن اسے پھر گالیاں سننا پڑیں کیونکہ دوبارہ دیکھنے پر مالک کو معلوم ہوا کہ چھلنی بھی نہیں ہے۔

چندن نے چھلنی لاکر رکھ دی اور لمحہ بھر کے لئے وہیں کھڑا رہا۔ اس کی دبی ہوئی نگاہ اپنی مالکن کے چہرے پر جا پڑی ——— خوبصورت لمبے، کھلے بالوں کی لٹیں اس کے گورے گلگوں چہرے پر بکھری ہوئی تھیں۔ ہونٹ سوکھے ہونے کے باوجود گیلے گیلے تھے مسکراتی سی آنکھوں میں خمار کی باریک سی لکیر تھی۔ اور چہرے پر ہلکا سا اضمحلال چھایا ہوا تھا۔ اس کے مالک نے بڑے پیار سے کہا "چائے بنا دو نا جان!"

لیکن جان نے روٹھتے ہوئے کروٹ بدل لی۔

میں کہتا ہوں "چائے نہ پیو گی" اسے مناتے ہوئے مالک نے کہا۔

"مجھے نہیں پینی چاہیئے" گال کو مسلتے ہوئے مالکن نے جواب دیا۔

گردن کے نیچے کا بازو اٹھا اور مالکن اپنے مالک کی آغوش میں پہنچ گئی۔

"ارے کیا کرتے ہو شرم نہیں آتی!"

چندن کا دل دھک دھک کرنے لگا، اور اس کے مالک کا قہقہہ کمرے میں گونج

اٹھا۔

"اٹھو بنا دو نا چائے" مالک نے بڑی ملائمت سے ہاتھ ڈھیلا چھوڑتے ہوئے کہا۔ "تمھارے گال ہی ایسے پیارے ہیں کہ خواہ مخواہ اُن پر چپتیں لگانے کو جی چاہتا ہو"

تڑپ کر مالکن نے پھر کروٹ بدل لی۔

"چندن! تم بناؤ چائے"

شدتِ احساس سے کانپتے ہوئے ہاتھوں سے چندن نے چائے کی پیالی بنائی۔

پیالی اٹھا کر اپنی جان کو آغوش میں بھینچتے ہوئے اس کے مالک نے پیالی اس کے ہونٹوں سے لگا دی۔

یہ 'جان' کا لفظ تھا، یا اس کے مالک کا اس کے سامنے بیوی کو آغوش میں لے لینے کا طریقہ کہ جب، چندن دوپہر کو کام کاج سے فارغ ہو کر اپنی کوٹھڑی میں جا لیٹا تو اس کے سامنے زہرہ جان کی تصویر کھنچ گئی۔ اور اس نے غیر ارادی طور پر سرسوں کے تیل اور مٹی میں سنے ہوئے بے غلاف کے خستہ اور بوسیدہ تکیے کو بے ساختہ اپنی آغوش میں بھینچ لیا۔

اچانک اُبل کر اوپر آ جانے والے دودھ کی طرح نہ جانے زہرہ کی یہ تصویر کس طرح اس کے بچپن کے گہرے وبے غار سے نکل کر اس کے سامنے آ گئی ——— وہی ناٹا سا قد، بھرا بھرا گدار جسم، بڑی بڑی چنچل آنکھیں، پان کی لالی سے رنگے ہونٹ، بھاری کولھے، وہی سینے کا ابھار اور وہی مسکراہٹ جس کے منبع کا پتہ ہی نہ چلتا تھا کہ آیا پہلے اس کی آنکھوں میں شروع ہوئی ہے یا ہونٹوں پر!

وہ اس وقت بہت چھوٹا تھا اور ماں باپ کے مر جانے کی وجہ سے اپنی نانی کے پاس رہا کرتا تھا۔ اس کی یہ موسی ایک سیٹھ کے بچوں کی دایہ تھی۔ یہ سیٹھ چاوڑی بازار

میں گراموفون اور دوسرے سازوں کی دکان کرتا تھا۔ اسی دکان کے سامنے زہرہ کا چوبارہ تھا۔ اور سیٹھ کی دکان کے باجے آہستہ آہستہ چاندی کے سکے بن بن کر وہاں پہنچا کرتے تھے۔

چندن اپنے بڑے بھائی اور پنڈت جی کے بڑے لڑکے کے ساتھ کبھی کبھی زہرہ کے چوبارہ پر چلا جاتا تھا۔

زہرہ پنڈت جی کے لڑکے کو پیار کیا کرتی تھی۔ مٹھائی وغیرہ دیتی تھی۔ اور اس مٹھائی کا کچھ چھوٹا حصہ ان دونوں بھائیوں کو بھی ملا کرتا تھا کبھی یار وہ دوسرے بچوں کے ساتھ چوبارہ کے باہر آنگن میں کھیل رہا ہوتا۔ اور سیٹھ جی زہرہ کے پاس جا بیٹھتے اسے اپنے آغوش میں لے لیتے یا اس کے زانووں پر سر رکھ کر لیٹ جاتے۔

اس کی یہ مالکن بھی تو زہرہ سے ملتی جلتی تھی ـــــــــ اسی جیسا ناٹا قد، اسی جیسے بھرے ہوئے گداز کولھے، بادلوں کی طرح اُمڈا ہوا سینہ، گول گول رس بھرے گال۔ بڑی بڑی مسکراتی آنکھیں اور نیلے ہونٹ۔ کون کہہ سکتا ہے کہ اس ایک لمحہ میں مالک کے پہلو میں اُسے لیٹے دیکھ کر ہی اسے زہرہ کی یاد آگئی تھی۔

تصور ہی تصور میں چندن زہرہ کے بالا خانہ پر پہنچ کر سیٹھ بنا اور اس کے زانوں پر لیٹ گیا اور زہرہ پیار سے اس کے بالوں پر ہاتھ پھیرنے لگی۔ . . . . وہ بھول گیا کہ اس کے ٹخنوں تک میل چڑھی ہوئی ہے خشکی کے باعث ٹانگوں کی جلد گھٹنوں تک بڑی سی بن گئی ہے۔ اس کی نیلی نیکر جو اس کے مالک نے کبھی دی تھی میل سے کالی ہو گئی ہے۔ اس کی قمیص کئی جگہ سے پھٹی ہوئی ہے۔ اس کے سیاہ نتھنے پر چوٹ کا ایک نہایت ہی بدنما داغ ہے۔ اس کا نچلا ہونٹ کٹا ہوا ہے اور اس کے سر کے بال چھوٹے چھوٹے کھڑے اور بھورے ہیں۔ وہ مست لیٹا رہا۔ اور زہرہ اس کے بالوں پر ہاتھ پھیرتی رہی۔ وہیں اس کے زانو پر لیٹے لیٹے اس نے کروٹ بدلی۔ اور پیار سے کہنا چاہا "زہرہ کتنی

اپنی ہو تم . . . ." لیکن اس کی کمر میں کوئی نکیلی سی چیز چبھ گئی۔ اور اس وقت اسے معلوم ہوا کہ وہ ننگے فرش پر لیٹا ہوا ہے۔ وہ چیز جس پر اس کا سر رکھا ہوا ہے زہرہ کا زانو نہیں بلکہ وہی بوسیدہ گلاسٹر اٹیچی کیس ہے۔

چندن نے سر جھٹک دیا لیکن وہ مسکرایا نہیں۔ اٹھ کر وہ دیوار کے ساتھ پیٹھ لگا کر بیٹھ گیا۔ وہیں بیٹھے بیٹھے کئی برس الٹے ہوتے سے گزر گئے۔ سیٹھ جی تو اپنی سب جائداد چوباروں کے حسن کی نذر کر کے اپنے نانک کے گاؤں چلے گئے تھے۔ جو وسطی پنجاب میں کہیں اپنی سادگی، غلاظت اور ناخواندگی کی گود میں لیٹا ہوا تھا۔ چندن کی موسی الور اپنے گاؤں چلی گئی تھی۔ اور چندن اس چھوٹی عمر میں ہی تین روپے ماہوار پر ان سیٹھ صاحب کے ایک دوست کے ہاں نوکر ہو گیا تھا۔ اس کے بعد اس کی زندگی اس کمبل کی طرح تھی جسے ایک جگہ سے رفو کیا جائے تو دوسری جگہ سے پھٹ جائے دوسری جگہ سے سیا جائے تو تیسری جگہ سے پھٹ جائے۔ اپنے اس مالک کے ہاں پہنچ کر اس نے سکھ کا سانس لیا تھا۔ اور اس نے محسوس کیا تھا کہ ایسا زندہ دل، خوش مزاج اور کھلی طبیعت کا مالک گذشتہ بارہ سال کی نوکری میں نہیں ملا لیکن اس کے مالک کا یہی کھلا پن اس کے لئے مصیبت بن گیا تھا۔ اس کا مالک اس کے سامنے ہی اپنی بیوی سے پیار کرنے میں ذرا بھی نہ جھجکتا، جیسے چندن آدمی نہ ہو مٹی کا لوندا ہو۔

چندن نے سوچا اس شادی سے پہلے وہ کتنے اطمینان سے رہتا تھا۔ یہ بے چینی سی، یہ گرمی گرمی سی۔ یہ اعضا کا تناؤ سا، یہ شب بیداری سی اس نے کبھی محسوس نہ کی تھی۔ وہ سوتا تھا تو اسے دین دنیا کا ہوش نہ رہتا تھا۔ لیکن جب سے اس کے مالک نے شادی کی تھی اور اس کی بیوی مالکن آئی تھی اس کی نیند اڑ سی گئی تھی۔ اسے عجیب عجیب طرح کے خواب آتے تھے۔ رات اس نے کاسنی کو دیکھا تھا۔ کاسنی اس سے پہلے مالک کی لڑکی تھی۔ جس کے سینے کو دیکھ کر جی ناشپاتیوں کا خیال آتا۔ ٹخنوں سے اونچا لہنگا اور بنڈی پہنے وہ ننگے

سر گھوما کرتی تھی یہی لڑکی خواب میں اس کے ساتھ آ بیٹھی تھی۔ کیسے، کہاں، اسے یاد نہیں لیکن وہ جاگ اٹھا تھا۔ اس کا جسم گرم تھا، اس کی نسیں تنی ہوئی تھیں۔ اسے پسینہ آ گیا تھا۔ پھر وہ سو نہ سکا تھا۔

کچھ بھی سمجھ میں نہ آ سکنے پر اپنی بیوقوفی پر اس نے سر ہلایا۔ لیکن مسکرایا نہیں۔ اس کا مالک دفتر گیا ہوا تھا۔ مالکن اندر کمرے میں گہری نیند سوئی ہوئی تھی۔ وہ اٹھا اور پڑوسی رائے صاحب کے نوکر جیٹھو کی کوٹھڑی کی طرف چل پڑا۔

چیت شدی پورن ماشی کا چاند بڑ کے پیچھے سے آہستہ آہستہ نکل رہا تھا۔ نوعمر کیکری کے پتے اس کی کرنوں کے لمس سے چمک اٹھے تھے۔ چندن آہستہ آہستہ اپنی کوٹھڑی سے نکلا۔ سامنے کوٹھی کے پورچ پر پھیلے ہوئے دو گن بیلیا کے سرخ گل اناری پھول چاندنی میں ہلکے سیاہی مائل معلوم ہوتے تھے۔ ایک ایک طرف گل مور کا پرانا درخت جس کا تنا پارسال دیمیاں بہت سے کاٹ دیا گیا تھا اپنی چند ایک شاخوں پر پتوں اور پھولوں کے گچھے لئے جھوم رہا تھا۔ دور سے یہ گچھے بادلوں کے ننھے ننھے ٹکڑے جیسے معلوم ہوتے تھے۔ لکروندے اور کھٹے کے پھولوں کی خوشبو فضا میں بسی ہوئی تھی۔ اگرچہ ابھی تک وہ سب کمرہ میں سوتے تھے لیکن آمد بہار کے باعث سردی زیادہ نہ رہی تھی۔ چندن ایک منٹ سے گوندنی کے درخت کے پاس جا کھڑا ہوا۔ اس نے بے خیالی میں ایک دو ننھی ننھی گوندنیاں توڑ کر منہ میں ڈال لیں پوری طرح پکی نہ تھیں۔ اس کا منہ بے مزا ہو گیا۔ ایک لمحہ تک وہ شش و پنج کی سی حالت میں وہیں کھڑا رہا۔ پھر وہ برامدے میں گیا۔ اور بڑی احتیاط سے بیٹھک کا دروازہ کھولا۔

سونے کا کمرہ بیٹھک کے ساتھ ہی تھا اور بیٹھک عام طور پر کھلی رہتی تھی۔ اس کا ایک دروازہ وہ باہر سے بند کر لیا کرتا تھا اور ایک مالکن اندر سے بند کر لیتی تھیں۔ اس نے آہستہ سے دوسرا دروازہ کھولا۔ مالکن کے سونے کے کمرہ میں ہلکی سی روشنی تھی۔ اس کا عکس دروازہ

کے شیشے پر پڑ رہا تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے گدلی روشنی کی کوچی کسی نے دروازے کے شیشوں پر پھیر دی ہو۔ آہستہ آہستہ دری پر پاؤں رکھتا ہوا چندن بڑھا اور جا کر دروازے کے ساتھ پنجوں کے بل کھڑا ہو گیا۔

اندر چھت میں لال رنگ کا بلب روشن تھا۔ اس کی مدھم روشنی میں وہ آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھنے لگا لیکن دوسرے لمحہ وہ بھاگا۔ اس کا جسم گرم ہونے لگا تھا۔ اعضا تننے لگے تھے۔ اس کا گلا اور ہونٹ خشک ہو گئے تھے۔ اور اس کی نسوں میں جیسے دودھ ابلنے لگا تھا۔

پنجوں کے بل بھاگ کر وہ باہر آیا۔ آہستہ سے اس نے دروازہ لگایا اور باہر چاندنی میں آ کھڑا ہوا۔ سامنے جنگل مور کا تنہ کھڑا تھا۔ اس کے جی میں آئی کہ اپنے سینے کی ایک ضرب سے وہ تنے کو گرا دے۔

کوٹھی کے سامنے لان میں فوارے کے گرد سرخی مائل پیلے پیلے پھولوں کے بے شمار پودے لہرا رہے تھے۔ جن کے چوڑے چوڑے پتوں پر پانی کی بوندیں پھسل پھسل کر آتی تھیں۔ گلکوندے کی خوشبو اور بھی تیکھی ہو کر فضا میں بس گئی تھی۔ چندن نے جا کر فوارے کی ٹونٹی کھول دی۔ پھر ریشمی پھوار اس پر پڑنے لگی۔ وہ جھیلو کے پاس کیوں گیا۔ وہ سوچنے لگا۔ دوپہر کے وقت ارد گرد کی کوٹھیوں کے نوکر جھیلو کی کوٹھری میں جمع ہوتے تھے۔ کبھی تاش کھیلتے، کبھی چوسر کی بازی لگاتے۔ کبھی اپنے مالکوں اور مالکنوں کی نقلیں اتارتے۔ کبھی کبھار جھیلو اپنے چھپائے ہوئے توے والا باجہ مانگ لاتا جو اس نے کبھی ایک کباڑی کی کلیرنگ سیل میں خریدا تھا۔ اس کی آواز ایسی تھی جیسے اسہال کا مریض بچہ رو رہا ہو لیکن وہ سب بڑے مزے سے "انار پر انگوری تیرے گورے گال پہ" یا "تو نے لاگی نجریا رے" سنا کرتے۔ حال ہی میں جھیلو چار آنے کا ایک نیا ریکارڈ لے آیا تھا۔ اور دوپہر بھر اس کوٹھری میں

تیری نظر نے مارا

ایک دو تین چار پانچ چھ سات آٹھ نو دس گیارہ

تیری نظر نے مارا

ہوتا رہتا تھا لیکن کبھی ادھر نہ گیا تھا۔ اس کے پاس وقت ہی نہ تھا۔ علی الصبح ہی اس کا مالک اسے جگا دیا کرتا تھا۔ وہ اس کے مالش کرتا۔ اس کیلئے نہانے کا پانی تیار کرتا۔ چائے بناتا۔ اس کے دفتر چلے جانے کے بعد دوپہر کے کھانے کا انتظام کرتا۔ کھانا بنا کر دفتر لے جاتا۔ آ کر کھانا کھاتا۔ اور سو جاتا۔ ایسی نیند سوتا کہ بارہا غروب آفتاب تک سوتا رہتا اور اس کے مالک کو ٹھوکریں مار کر اسے جگانا پڑتا لیکن آج اپنی بے خوابی سے ہار کر جب وہ دوپہر کو جھبو کی کوٹھڑی میں گیا تو اس نے ایسی باتیں سنیں کہ اس کی رہی سہی نیند بھی حرام ہو گئی۔

پھوار کے پڑتے ہی اس کے جسم میں جھرجھری سی اٹھی، وہ ڈرا، کہیں اسے بخار تو نہیں ہو گیا۔ رت بدل رہی ہے اور وہ پانی نل کے نیچے کھڑا بھیگ رہا ہے۔ اگر نمونیہ ہو گیا تو؟ اس نے سر کو ایک بار جھٹکا دیا۔ لیکن وہ مسکرایا نہیں اور فوراً نل کو کھلا چھوڑ کر ہی اپنی کوٹھڑی میں جا کر لیٹ گیا۔

لیکن جلد ہی اس کی آنکھ کھل گئی، اس کا سر بھاری تھا جسم پر بخار کی سی کیفیت طاری تھی اور آنکھیں کچھ ابلتی ہوئی محسوس ہو رہی تھیں۔ اس نے پھر ایک خواب دیکھا تھا ——— کچی ناشپاتیوں کے گچھے اس کے سر کے گرد گھوم رہے ہیں۔ وہ ایک ویران سے مکان میں کھڑا انھیں پکڑنے کی کوشش کر رہا ہے۔ پاس ہی پانی کا ایک نل چل رہا ہے اور اس کے پاس ایک بچہ کھڑا چلا چلا کر کہہ رہا ہے۔ میرا کھلونا مت توڑو میرا کھلونا مت توڑو۔ وہ سر اٹھا کر ادھر دیکھتا ہے۔ وہ بچہ کاسنی بن جاتا ہے اور وہ سنتا ہے

——— میری ناشپاتیاں مت توڑو، میری ناشپاتیاں ....

چندن جنوریوں کی طرح اٹھا جھبو کے الفاظ اس کے کانوں میں گونج گئے۔ اس نے کرتا پہنا۔ ایک پرانے مٹی کے غلیظ کوزہ میں سے پرانا سا بٹوہ نکال کر جیب میں رکھا۔ کوٹھڑی

کی کُنڈی لگائی اور آہستہ آہستہ کوٹھی سے باہر نکل گیا۔

چاندنی ایک وسیع شامیانہ کی طرح پریڈ گراؤنڈ پر پھیلی ہوئی تھی اور سڑکوں کے نیم جیسے اس شامیانہ کو تھامے کھڑے تھے۔ ان کے پتّوں سے بجلی کے قمقمے ٹمٹما اٹھتے تھے اور دور سے دیکھنے پر ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے اُن کے پرے کوئی الاؤ جل رہا ہو۔

چندن کوئن میری روڈ پر ہو لیا۔ دائیں طرف کی کوٹھی سے گکرونڈے، کھٹّے، رات رانی اور مولسری کی ملی جلی خوشبو کا ایک جھونکا آیا۔ اور سڑک پر درختوں کے نیچے بچھے ہوئے روشنی اور سایہ کے جال ملے۔

تیس ہزاری کے چوراہے پر وہ رُکا کہ شاید کوئی ٹریم آتی ہوئی مل جائے لیکن شاید گیارہ کبھی کے بج چکے تھے۔ سڑک بالکل سنسان تھی، ایک گندگی کی گاڑی عفونت پھیلاتی ہوئی اس کے پاس سے گزر گئی۔ چندن کا دماغ پھٹا گیا۔ بھاگ کر وہ مٹھائی کے پُل پر ہو لیا۔ جس چبوترے پر سپاہی کھڑا رہتا تھا وہ ٹوٹا ہوا تھا۔ شاید کسی موٹر والے نے سپاہی کی کرختگی کا بدلہ اس معصوم چبوترہ سے لیا تھا۔ پُل پر بالکل سناٹا تھا اور چاند چمک رہا تھا۔ اور پُل کے نیچے گہرائی اور تاریکی میں ریل کی لائنیں اور سامنے کچھ دُور لال ہرے سگنل چُپ چاپ ٹمٹما رہے تھے۔ چندن پُل کی دیوار کے ساتھ سر لگائے لمحہ بھر تک مبہوت و ساکن ان ناگنوں سی لائنوں اور اُن ٹمٹماتے ہوئے سگنلوں کو دیکھتا رہا۔ پھر وہ آگے چل پڑا۔

سڑک بالکل سنسان تھی۔ دونوں طرف کی دُکانیں بند تھیں اور فٹ پاتھ پر غلیظ سے لحاف لیے کہیں کہیں دکاندار سو رہے تھے۔ میلی کچیلی دھوتیوں میں ان کے گورے گورے اعضا پورنماشی کی اس چاندنی میں اور بھی چمک رہے تھے۔ تیلیواڑہ کے سامنے سڑک کے بائیں طرف فٹ پاتھ پر ایک ٹوٹا ہوا تانگہ پڑا تھا اور دو تین کوڑے کی خالی گاڑیاں کھڑی تھیں اس کے بعد دور تک سفید سی دیوار چلی جاتی تھی۔ جس کے پیچھے کبھی کسی گاڑی کے تیز تیز گذر

کی آواز آجاتی تھی۔ دائیں طرف دکانوں کے باہر کہیں بانسوں کے گٹھے پڑے تھے کہیں چارپائیاں اور کہیں لکڑی کی خالی پیٹیاں۔ چندن چپ چاپ اپنے خیالات میں محو قطب روڈ کو چھوڑتے صدر بازار آگیا۔

صدر بازار بالکل بند ہوگیا تھا۔ صرف کونے کے حلوائی کی دکان کھلی تھی۔ چندن کی بھڑکی ہوئی طبیعت یہاں تک آتے آتے قریب قریب ٹھنڈی ہوگئی تھی۔ صرف اس کے دل میں اشتیاق کا ایک ہلکا سا جذبہ موجود تھا۔ اور اسی کے ماتحت اس نے حلوائی کی دکان سے آدھ سیر گرم گرم دودھ پیا اور پھر جیسے نئی امنگ پا کر وہ آگے بڑھا۔ دونوں طرف کی دکانیں بند تھیں ؛ بائیں طرف کے ماشاء اللہ ہوٹل میں بیٹھا کوئی شخص روٹی کھا رہا تھا۔ دائیں بائیں کہیں کہیں کسی پنواڑی یا حجام کی دکان کھلی تھی۔ ایک دکان میں ایک مزدور (جسے دن میں شاید فرصت نہ ملتی تھی) بیٹھا سر پر استرا پھروا رہا تھا۔ کاٹھ بازار کے رستے پر چندن ایک لمحہ کیلئے رکا۔ تانگوں کے اڈے پر ایک دو تانگے والے ابھی گھوم رہے تھے۔ چاند تانگہ سٹینڈ کے عین اوپر چمک رہا تھا۔ چاندنی میں گرد اور دھوئیں کا غبار بھی ملا ہوا تھا۔ وہ کاٹھ بازار میں داخل ہوا اور حیران سا ایک چوبارے کی طرف دیکھنے لگا جس میں گیس کی روشنی کے سامنے ایک خوبصورت لڑکی بیٹھی تھی۔ چندن کی مری ہوئی امنگ پھر جاگی لیکن یہاں ابھی تک کئی آدمی کھڑے تھے۔ اتنے آدمیوں کے دیکھتے ہوئے اتنی روشنی میں اس کیلئے معاملہ کی بات کرنا مشکل تھا۔ اس نے نیچے کی کوٹھڑیوں کی طرف دیکھا۔ ہر ایک کوٹھری کے آگے ایک ایک لیمپ لٹک رہا تھا۔ اور ایک ایک عورت کھڑی یا بیٹھی تھی کبھی کبھی کسی کوٹھڑی کا دروازہ بند ہو جاتا اور کسی شخص کے پیچھے لیمپ اٹھائے ہوئے عورت ایک غلیظ سے پردہ کے اندر چلی جاتی تھی۔ لمحہ بھر کیلئے ابھری ہوئی امنگ چندن کو چھوڑتی ہوئی محسوس ہوئی۔ اور وہ ذرا آگے بڑھ کر ایک لوہے کی کرسی پر بیٹھ گیا جو عین چوک پر پڑی ہوئی تھی اور جس کے پاس ایک میز پر رنگ برنگی بوتلیں رکھے ایک دو چمپی کرنیوالے بیٹھے تھے۔

"چمپی کراؤ گے؟" چندن نے غیر ارادی طور پر سر ہلا دیا۔ ساتھ ہی ایک اور ایسی ہی دکان سجی تھی اور اس کے پاس بچھے ہوئے بنچ پر ایک شخص بیٹھا چمپی کروا رہا تھا اور اس کے سر پر ایک

لمبے برامدہ میں اپنی اپنی کوٹھریوں کے سامنے عورتیں کھڑی اپنے گاہکوں کو بلا رہی تھیں تھک جانے کے ڈر سے انھوں نے چھت میں رسّیاں لٹکا رکھی تھیں جن کے سہارے وہ کھڑی ہو جاتی تھیں۔ چندن کے سر میں تیل کے پڑنے سے ایک عجیب سی سرسراہٹ ہوئی اور پھر حجام کالڑکا چمپی کرنے لگا۔ چمپی کرنے کے بعد اس کی پیشانی اور گردن کو ایک غلیظ سے تولیے سے پونچھ کر اس نے اس کے بال بنا دیئے۔ چندن جب وہاں سے اٹھا تو اسے ناک میں سستے خوشبو دار تیل کی بو آ رہی تھی۔ اور اس کی امنگ پھر جیسے بیدار ہو گئی تھی۔ چوک چھوڑ کر وہ ایک گلی میں ہو گیا۔ یہاں لوگ کم تھے اور روشنی بھی اتنی نہ تھی۔ وہ ایک بار گلی کے دوسرے سرے تک جا کر مڑ آیا۔ اس کی سمجھ میں نہ آتا تھا کہ وہ کیسے بات چیت شروع کرے۔ وہ تو ان سے آنکھیں بھی نہ ملا پاتا تھا۔ محض خیال ہی سے اس کا دل دھک دھک کرنے لگتا تھا۔ اس نے سوچا واپس چلا جائے۔ اسے جیٹھو کے ساتھ آنا چاہیئے تھا۔ اس نے سوچا گلی میں سے ہوتا ہوا دوسری طرف نکل جائیگا لیکن اتنی دور آ کر وہ واپس بھی نہ جانا چاہتا تھا۔ لیکن اسی وقت ایک کوٹھری کے آگے قدرے اندھیرے میں بیٹھی ہوئی ایک تھل تھل پلپلی عورت نے اس کی مشکل حل کر دی۔ اس کے پاس دو چھوٹی چھوٹی لڑکیاں فرش پر ہی دری بچھائے لیٹی ہوئی تھیں بالکل کاسی کی عمر کی! "آؤ ادھر آؤ" پیار سے اس نے کہا۔

سرگوشی سے اس نے کہا! "آؤ سوچتے کیا ہو؟ ۲ ارنکیں لگے" اشارہ اس کوٹھری کے سامنے بیٹھی ہوئی عورت کی طرف تھا جو صرف ایک بنیان اور کالی ساڑھی پہنے بیٹھی تھی جس کی بغلوں کے بال تک نظر آتے تھے۔ اور جس کا ڈھلا ہوا بدن مکڑی کی طرح تھا۔

چندن نے اس کے پاس فرش پر آدھی لیٹی اور آدھی بیٹھی لڑکی کی طرف حسرت بھری نظر سے دیکھا جس کی ناک میں ایک چھوٹی سی نتھ تھی۔ کچھ سمجھ کر موٹی عورت نے کہا! "یہ تو ابھی اتنی چھوٹی ہے۔ یہ ابھی یہ سب کیا جانے!"

چندن کے دماغ میں کچی ناشپاتیاں گھوم گئیں۔ پھر کاسی اور پھر کچی ناشپاتیاں۔

اور موٹی عورت نے کہا "دو روپئے لگیں گے"

چندن چُپ رہا۔ وہ کہنا چاہتا تھا "دو روپئے بہت ہیں!"

تبھی موٹی عورت نے کہا "اچھا تو ڈیڑھ روپیہ ہی دیدو۔ ابھی تو نتھ بھی نہیں اتری"

چندن کی نسوں میں دودھ ابلنے لگا۔ اس کا جسم گرم ہونے لگا۔ دوسرے لمحہ وہ اُس غلیظ پردے کے اندر چلا گیا۔ اور اس کے پیچھے اس لڑکی کو لئے ہوئے وہ موٹی عورت۔

ایک ہفتے بعد سر پر اپنا بوریہ بستر اٹھائے چندن پورچ میں کھڑا تھا۔ اور اندر کمرے میں اس کے مالک اپنی بیوی کو ہدایت دے رہے تھے۔ میں ابھی ڈاکٹر کو بھیجتا ہوں سب کان کوڈس انفکٹ (جراثیم سے پاک) کروالینا۔ سب جگہ اب تو جا رہا ہے کمبخت!

اور چندن بے بسی کی حالت میں کھڑا سوچ رہا تھا۔ لیکن لڑکی کی عمر تو تیرہ سال کی بھی نہ ہوگی۔ اور اس کی تو ابھی نتھ بھی نہ اتری تھی؟

ترغیب گناہ

شادی کے وقت وہ بی۔اے کا امتحان دے کر فارغ ہوئے تھے۔ لیکن ملازمت آپ جانتے ہیں آسانی سے نہیں مل سکتی اور نہ انھیں ملی۔ لیکن تھے اولوالعزم۔ کہیں نہ کہیں پرائیویٹ طور پر نوکری کرتے رہے۔ اوّل اوّل میرے ساتھ ان کا سلوک نہایت اچھا رہا۔ وہ مجھ سے دیوانہ وار محبت کرتے رہے۔ وہ ایسے ایسے فقرے بولتے جو میری سمجھ میں نہ آتے۔ ایسی ایسی باتیں کہتے جو میرے شعور سے بالاتر ہوتیں۔ وہ کہتے "لتیا!" اور میں ان کی طرف دیکھنے لگتی۔ ان کی آواز میں کچھ ایسی بات، کچھ ایسی لکنت، کچھ ایسا سحر ہوتا کہ میرا سارا جسم کانپ جاتا۔ ان کی آنکھوں میں کچھ ایسی مستی ہوتی اور وہ مجھے کچھ اس والہانہ انداز سے پکڑ لیتے کہ میں ڈر جاتی۔ میری نس نس کانپ اٹھتی۔ اور پھر وہ اپنے بازوؤں میں بھینچ کر چوم لیتے۔ لیکن آہستہ آہستہ میں

ان سب باتوں سے مانوس ہوتی گئی ۔ مجھے ان میں ایک عجیب طرح کا حظ حاصل ہونے لگا ۔ اور پھر میں خود ان باتوں کی محرک ہونے لگی ۔ وہ دن بھر مارے مارے پھرتے ۔ کہیں دو تین گھنٹے دفتر میں کام کرتے ۔ ٹائپ کا کام ایک دوسری جگہ کرتے پھر باقی وقت میں ٹیوشنیں پڑھاتے ۔ شام کو تھکے ہارے آتے اور کھانا کھاتے ہی سو جاتے لیکن میں چاہتی وہ میرے ساتھ اسی طرح محبت کیا کریں ۔ وہ مجبور تھے ۔ میں انھیں چھیڑتی تو وہ اونہوں کر کے کروٹ بدل لیتے ۔ میں انھیں جگاتی تو وہ جھڑک کر سو جاتے اور میرے دل میں کچھ خوف سا پیدا ہو جاتا ۔ کہیں وہ اور طرف تو نہیں لگے جوں جوں میں سوچتی میرے دل میں یہ شبہ زور پکڑتا جاتا ۔

ان ہی دنوں میں انھوں نے لڑکیوں کا ایک اسکول کھولا ۔ اصل میں یہ تجویز تو ان کے دماغ میں بہت پہلے سے تھی ۔ لیکن اس تجویز کو عملی جامہ پہنانے کے لئے انھیں ضروری مدد نہ مل رہی تھی ۔ بارہا وہ کہا کرتے تھے ۔ کاش تم تعلیم یافتہ ہوتیں تو پھر یہ روٹی کا مسئلہ حل ہو چکا ہوتا ۔ مرد کیلئے گرل اسکول کھولنا اتنا ہی مشکل ہے جتنا عورت کیلئے لڑکوں کا اسکول کھولنا ۔ بلکہ مرد کیلئے لڑکیوں کا اسکول کھولنا اس سے بھی مشکل ہے ۔ ہاں کوئی عورت ساتھ ہو اور ذرا رسوخ والی ہو تو یہ مشکل آسان ہو جاتی ہے ۔ اس دفعہ انھیں یہ مدد مل گئی ۔ وہ کچھ دنوں سے ڈسٹرکٹ بورڈ گرلز اسکول کی ہیڈ مسٹریس کو انگریزی پڑھانے لگے تھے ۔ ان کے کوئی لڑکا نہ تھا ۔ اس لئے میں نے سنا کہ وہ انھیں کو لڑکے کی طرح پیار کرنے لگی ہیں ۔ ان ہی کی تحریک پر انھوں نے اپنی تجویز کو عملی جامہ پہنانا شروع کیا ۔ ان ہی کی مدد سے لڑکیاں آئیں ۔ رہنے کیلئے انھوں نے ہمیں اپنے گھر کا ایک حصہ دیدیا اور یہیں سے میری بدنصیبی کی داستان شروع ہوئی ۔

یہاں آکر ان کا زیادہ وقت "بی بی جی" کے کمرے ہی میں گذرنے لگا ۔ اور

ہیں اپنے کمرے میں اداس بیٹھی رہنے لگی۔ میں نے ان سے کئی بار کہا بھی کہ آپ سارا سارا دن اور آدھی آدھی رات تک اُدھر کیوں بیٹھے رہتے ہیں۔ لیکن وہ ہمیشہ یہ کہہ دیا کرتے "تم کیا جانو! اسکول کا چلانا کیا آسان بات ہے۔ سو معاملے طے کرنے ہوتے ہیں۔ سو باتوں کے متعلق ان سے مشورہ کرنا ہوتا ہے" میں مان لیتی اور خاموش ہو جاتی۔ اور وہ میرے گال پر ہلکا سا تھپیڑا لگا کر مجھے چوم لیتے۔

اداسی کو رفع کرنے کیلئے میں نے پڑھنا شروع کر دیا تھا۔ انھوں نے بھی کئی بار خواہش ظاہر کی تھی کہ اگر میں پڑھ جاؤں تو اسکول اچھی طرح چل سکتا ہے۔ اس لئے رتن کی تیاری شروع کر دی۔ ان سے ایک نوجوان انگریزی پڑھنے آتا تھا۔ شاستری تھا۔ دسویں کا امتحان دے چکا تھا۔ اب ایف اے کا امتحان دینا چاہتا تھا۔ نام تھا بلونت۔ چنانچہ میں ان سے ہندی پڑھنے لگی۔

بلونت نوجوان تھے۔ خوش مزاج تھے، ہنس مکھ تھے۔ لیکن بے حد بھلے مانس۔ پڑھائی کے دوران میں بھی انھوں نے آنکھ اوپر نہ اٹھائی۔ میں جب بھی انھیں دیکھتی کتاب پر نظریں جمائے پاتی۔ بہت آہستہ بولتے۔ اور پڑھا لینے کے بعد بہت دیر نہ ٹھہرتے۔ چھ ماہ پڑھکر ہی میں نے رتن کا امتحان دیدیا۔ اچھے نمبروں سے پاس ہو گئی۔ میں نے "بھوشن" کی کتابیں منگا لیں لیکن اس دوران میں ایک بات ہو گئی جس نے میری زندگی کے رُخ کو پلٹ دیا۔

وہ، جیسا کہ میں کہہ چکی ہوں بی بی جی کے کمرہ میں زیادہ دیر رہتے تھے جب تک میں امتحان کی تیاری میں مصروف رہی میں نے اس طرف دھیان نہیں دیا۔ لیکن بلونت جی کچھ دنوں کیلئے اپنے گاؤں چلے گئے اور میرا دل پھر اداس رہنے لگا۔ میں نے انھیں اپنی طرف ملتفت کرنے کی کوشش کی لیکن انھوں نے توجہ تک نہ دی۔ ہمیشہ ٹال دیا۔ میرا سویا ہوا شبہ پھر جاگ اٹھا۔ میں پوشیدہ طور پر ان کی نگرانی کرنے

لگی۔ ہم جس حصہ میں رہتے تھے وہ بی بی جی کے حصہ سے بالکل جدا تھا۔ سیڑھیاں بھی جدا تھیں اور صحن بھی جدا لیکن جس کمرہ میں وہ رہتی تھیں وہ ہمارے اسباب کے کمرہ کے ساتھ تھا۔ ایک لکڑی کی دیوار دونوں میں حائل تھی۔ میں آہستہ آہستہ سوراخ بنانے میں کامیاب ہو گئی۔

برسات کی رات تھی۔ ذرا ذرا سردی ہو گئی تھی اور ٹھنڈی ہوا کے جھونکے اندر آ رہے تھے۔ میرے دل کو نہ جانے کیا ہو رہا تھا۔ میں چاہتی تھی وہ آ جائیں۔ لیکن وہ نہ آئے۔ گیارہ بج گئے تب بھی نہ آئے۔ تب میں اسباب کے کمرے میں آ گئی پھر آہستہ آہستہ سوراخ کرنا شروع کیا۔ اس دفعہ ایک باریک سا سوراخ ہو گیا۔ میں خوشی کے مارے اچھل پڑی۔ ذرا سانس لے کر میں نے سوراخ میں دیکھا۔ کانپ اٹھی۔ وہ اور بی بی جی ایک ہی بستر پر سوئے ہوئے تھے۔ اور بی بی جی کا بازو ان کے گلے میں تھا۔

میں نے کہا "مجھ سے یہ سب کچھ نہ دیکھا جائے گا"

وہ خاموش کھڑے رہے۔ پھر بولے "کچھ بات بھی ہو!"

ہماری آنکھیں چار ہوئیں۔ ان کا رنگ کچھ پھیکا سا پڑ گیا۔

میں نے کہا "جو کچھ اتنی دیر سے ہو رہا ہے اور جو کل رات ہوا" ان کا رنگ اور پھیکا پڑ گیا لیکن غصے سے بولے "کیا ہو رہا ہے اور کیا ہوا؟"

"میرے ہی منہ سے سننا چاہتے ہو؟"

وہ خاموش رہے، اس وقت میرے تمام جسم میں آگ سی لگی ہوئی تھی۔ رات وہ منظر دیکھ کر میں کتنی دیر تک وہیں کھڑی رہی تھی۔ مجھے اپنی آنکھوں پر اعتبار نہ آیا تھا۔ لیکن نہیں وہ وہاں سوئے ہوئے تھے اور بی بی جی کا بازو ان کی گردن

کے گرد حمائل تھا۔ میں نے ایک بار پھر دیکھا۔ حسد اور رقابت سے میری آنکھوں میں خون اتر آیا۔ جی میں آیا۔ ابھی جا کر پوچھوں کہ آخر اس گناہ آمیز ڈھونگ کی کیا ضرورت ہے۔ کیوں نہیں کھلے بندوں محبت کا بازار گرم کیا جاتا۔ بیوی ——— بیوی کیا کر سکتی ہے سنسکاروں، اُپدیشوں اور دھرم کی زنجیروں میں جکڑی ہوئی۔ خاوند کو بُرائی کی طرف جانے سے نہیں روک سکتی۔ پتی برت دھرم اس بات کا متقاضی ہے کہ خاوند چاہے جو کرے عورت اس کے کسی کام میں مخل نہ ہو۔ بلکہ حتی الوسع اس کی ہر جائز اور ناجائز خواہش کی تکمیل میں مددگار ثابت ہو۔ میں نے ایک لمبا سا سانس لیا۔ جسم میں کچھ تھکاوٹ سی محسوس ہوئی۔ ایک بار پھر میں نے اسی سوراخ سے دیکھا۔ حسد نے پھر رگ رگ میں آگ کی لہر دوڑا دی۔ جی میں آئی جاؤں اور جا کر وہیں اس کمرے میں اپنا سر پھوڑ لوں۔ مر جاؤں۔ لیکن پھر خیال آیا پہلے ان سے کیفیت پوچھ لوں۔ ان کو صاف صاف کہلوا لوں اور کہہ دوں کہ میں یہ سب کچھ برداشت نہ کروں گی۔ اگر وہ نہ مانے تو مر جاؤں گی اور بتا دوں گی کہ بیوی کی موجودگی میں کسی دوسری عورت سے محبت کرنے کا کتنا اندوہناک انجام ہے۔ میں اپنے کمرے میں آ گئی اور بستر پر پڑی بہت دیر تک روتی رہی۔ بارہ بجے، ایک بجا اور پھر دو بجے۔ ان کا انتظار کرتی رہی لیکن وہ نہ آئے پھر ایک دفعہ پہلو میں ٹیس سی اٹھی۔ پھر اسباب کو پھاندتی ہوئی دیوار کے پاس آ گئی۔ دیکھا کہ وہ ابھی تک اسی طرح سوئے ہوئے تھے۔ فرق صرف اتنا تھا کہ اب اس کا ہاتھ اس کی گردن میں تھا۔ بے بسی، غم اور غصے کی آگ میں جلتی ہوئی میں واپس آ گئی۔ مایوسی، لاچاری اور مجبوری سے کئی طرح کے خیالات میرے دماغ میں پیدا ہو گئے۔ باہر بارش ہو رہی تھی۔ سردی بھی زیادہ ہو گئی تھی لیکن میں نے دوپٹہ تک نہ اوڑھا۔ اسی طرح بستر پر پڑی رہی۔ صبح ہو گئی۔ چھ، سات اور پھر آٹھ بجے۔ نو بجے کے قریب وہ اسی طرف سے نہا دھو کر آئے۔ میرا سر دُکھ رہا تھا۔ درد و کرب سے میں تلملا رہی تھی۔ میں نے

فیصلہ کرلیا تھا کہ خاموشی سے سب کچھ برداشت نہ کروں گی۔ میری چھاتی پر مونگ دلے جائیں اور میں خاموش رہوں، یہ مجھ سے نہ ہو سکے گا۔ چنانچہ ان کے آتے ہی جھگڑا ہو گیا۔ وہ خاموش تھے۔

میں نے کہا "چپ کیوں ہو۔ صاف صاف کیوں نہیں کہہ دیتے کہ آپ کو میری ضرورت نہیں۔"

وہ بولے "آخر تمہیں ہو کیا گیا ہے۔ جو بات ہے صاف صاف سیدھے طور پر کہہ دو۔ پہیلیاں بجھوانے سے کیا مطلب؟"

"رات کو آپ کہاں سوئے تھے؟"

"وہیں اُدھر ہی سو گیا تھا۔"

"تنہا!"

ایک لمحہ کیلئے وہ خاموش رہے۔ پھر بولے "ہاں۔ کیوں؟"

"وہ آپ کے ساتھ نہیں سوئی تھیں۔ اور آپ روز اکٹھے نہیں سوتے؟"

انھوں نے ایک قہقہہ لگایا "اچھا یہ بات ہے۔ تم عورتیں بھی . . . تم سے پالا پڑے۔ بھلا اتنی سی معمولی بات پر تم نے طوفان برپا کر دیا۔ اگر وہ بھی بستر پر سوئی ہوئی تھیں تو کیا بات ہے۔ رات زیادہ وقت تک کام کرتا رہا۔ دن کا تھکا ہوا تھا وہیں نیند آ گئی۔ چارپائی ایک ہی تھی۔ وہ بھی وہیں لیٹ گئی ہوں گی۔ معمولی بات ہے وہ مجھے اپنا بچہ سمجھتی ہیں۔" یہ کہہ کر انھوں نے حسب معمول میرے گال پر ایک ہلکا سا چپت لگا کر مجھے چوم لیا۔

لیکن اس دفعہ میں نے ان کی بات نہ مانی۔ مجھے یقین ہی نہ آیا۔ بلکہ ان کے اس سلوک سے میرا شبہہ اور پختہ ہو گیا۔ میں نے اپنے آپ کو علیحدہ کرتے ہوئے کہا کہ "تو تمھیں اپنا بچہ سمجھتی ہیں۔"

"ہاں!"

"اور تم انھیں ماں کے برابر سمجھتے ہو؟"

انھوں نے میرے سوال کا جواب نہ دیا۔ بولے "آخر آج تم کیسی بیوقوفوں کی سی باتیں کر رہی ہو۔ اٹھو کھانا بناؤ مجھے بھوک لگ رہی ہے"

لیکن مجھ پر ضد سوار تھی۔ میں فیصلہ کرنا چاہتی تھی۔ یا وہ رہے گی یا میں۔ ایک میان میں دو تلواریں نہ سما سکیں گی۔ میں نے کہا "میری بات کا جواب دو!"

"آخر تم کیا پوچھنا چاہتی ہو؟"

"وہی جو میں نے پوچھا!"

"تم کیا سمجھتی ہو؟"

"میں جو چاہے سمجھوں آپ کیا سمجھتے ہیں؟"

انھوں نے بات کے رُخ کو پلٹنے کی غرض سے کہا "جو تم سمجھتی ہو وہی میں سمجھتا ہوں!"

مجھے یقین ہو گیا۔ ان کے دل میں چور تھا۔ وہ انھیں "ماں" نہ کہہ سکتے تھے۔ میرے سوال کا جواب دینے میں انھیں اسی لئے تامل تھا۔ ان میں اتنی جرأت نہ تھی کہ سچ بات کہہ دیتے۔ گناہ گار کا دل کمزور ہوتا ہے۔ لیکن میں اس طرح پیچھا نہ چھوڑنا چاہتی تھی۔ رات جو کچھ میں نے دیکھا تھا وہ سب میری آنکھوں کے سامنے پھر گیا۔ انھوں نے میری وفا کی یہ قدر کی۔ میں چاہتی تھی جو ہوا ہو چکا اب آئندہ تو کچھ نہ ہو۔ میں نے کہا۔

"اچھا آپ جو چاہیں سمجھیں لیکن آپ زیادہ دیر تک وہاں نہ رہیں"

"کام ہوتا ہے!"

"یہاں لے آئیں"

"ان سے مشورہ کرنا ہوتا ہے!"

"یہاں بُلا کر کر لیا کریں!"

"ایسا نہیں ہو سکتا!"

"نہیں ہو سکتا!" میں نے ان کی طرف دیکھا۔ میری آنکھوں میں آنسو اُمنڈ آئے۔

"نہیں ہو سکتا،" انھوں نے بے پروائی سے کہا۔

میرے تن من میں پھر آگ لگ گئی۔ میں ضبط نہ کر سکی۔ میں نے کہا "تو پھر "ماں اور بچہ" کا ڈھونگ چھوڑ دیجیے۔ کُھل کھیلنے یا مجھے میکے چھوڑ آئیے۔ یا پھر زہر لا دیجیے۔ اس کے بعد وہاں دن رہیے، رات رہیے۔ ایک بستر پر آرام فرمائیے۔ گلے میں باہیں ڈال کر سوئیے۔ کوئی دیکھنے نہ آئے گا۔ کوئی پوچھنے نہ آئے گا۔"

وہ غصے سے کانپنے لگے۔ پاس پڑی ہوئی چھڑی اٹھا کر انھوں نے تڑا تڑ مجھے زد و کوب کرنا شروع کر دیا۔ گالیاں بھی دیں۔ چھڑی ٹوٹ گئی تو لاتوں اور مکوں سے کام لیا گیا اور پھر اندر چلے گئے۔

ازدواجی زندگی میں یہ پہلا موقع تھا کہ مجھے پیٹا گیا۔ ایک تو سینے پر سوت کو بٹھا دیا۔ دوسرے مار، رنج اور اندوہ کے مارے میری رگ رگ جلنے لگی۔ لیکن میں چیخی نہیں، چلائی نہیں، ہاں آنکھوں کو قابو میں نہ رکھ سکی۔ آنسوؤں کا دریا بے اختیار بہہ نکلا۔

چند لمحے کے بعد انھوں نے کہا "چلو تمھیں میکے چھوڑ آؤں۔"

لیکن اس طرح گھر کو آگ لگنے دے کر نکل جانا مجھے منظور نہ تھا۔ وہ جانے کیا کیا کہتے رہے۔ گالیاں بھی دیں اور ڈرنا بھی لا رکھا۔ لیکن میں بدستور دہلیز پر بیٹھی رہی۔ اس وقت میری حالت اس بچے کی سی تھی جسے ساتھ نہ کھلایا جائے اور وہ وہیں بیٹھ جائے کہ نہ کھیلوں گا اور نہ کھیلنے دوں گا۔

بلونت جی اپنے گاؤں سے واپس آگئے تھے۔ میں امتحان کی تیاری میں مصروف تھی۔ خیال کو اس طرف سے ہٹانے کا سب سے بہتر ذریعہ پڑھائی ہی تھا۔ اور میں دن رات کتابوں کے مطالعہ میں ڈوبی رہتی تھی۔ وہ بھی اس روز کے واقعہ سے سنبھل گئے تھے مگر اپنا وطیرہ انھوں نے نہ چھوڑا تھا۔ وہ وہاں روزانہ جاتے تھے لیکن بہت دیر تک نہ ٹھہرتے تھے۔ جلد آجاتے تھے۔ اب وہ بھی کبھی کبھی آنکلتی تھیں۔ مجھ سے بھی ان کی محبت بہت بڑھ گئی تھی۔ کوئی بیس سال کی عمر ہوگی۔ رنگ گورا، تیکھی چتون اور ایسی حسین کہ دیکھ دیکھ کر جی نہ بھرتا تھا۔ بس ایک بار دیکھو تو دیکھتے ہی رہو۔ آنکھوں میں غضب کی کشش تھی اور مسکراہٹ میں جادو بھرا تھا۔ ایک دفعہ مسکرا کر حشر برپا کر دیتی تھیں۔ تھیں تو بیوہ مگر سنگار میں سہاگنوں کو مات کرتی تھیں۔ مجھے اپنی چھوٹی بہن کی طرح پیار کرتی تھیں۔ کچھ نہ کچھ روز پہنچا دیتی تھیں۔ ایک ماہ کے عرصے میں ایک دو عمدہ دھوتیاں اور ایک نفیس ساری بھی لیکر انھوں نے بھیجی۔ مجھے کئی بار سیر کو بھی ساتھ لے گئیں۔ میرے دل میں ان کے خلاف جو جذبات پیدا ہوئے تھے عنقا ہونے لگے۔ اب ان کی شدت میں کمی آنے لگی۔ مجھے افسوس ہوا کیوں میں نے اپنے خاوند کے خلاف ان شبہات کو جگہ دی۔ کیوں میں دل میں انھیں کوستی رہی۔ ایسی نیک عورت بھلا کبھی اتنی بُری ہوسکتی ہے۔ لیکن دل نہ مانتا تھا۔ اس دن میرے سوال کا جواب دینے میں انھوں نے جس ہچکچاہٹ سے کام لیا تھا اس نے میرے شک کو یقین میں بدل دیا تھا۔ اور اب اس یقین کی بنیادیں ہلائی نہ جاسکتی تھیں۔

ایک دن وہ دیر سے گھر آئے۔ مجھے یقین تھا وہ اُدھر ہی بیٹھے رہے ہوں گے اس لئے زیادہ کریدنا مناسب نہ سمجھا۔ صرف اتنا پوچھا "اُدھر سے آرہے ہو۔ طبیعت تو اچھی ہے نا؟"

"ہاں!" انھوں نے جواب دیا "یونہی باتیں کرتے دیر ہوگئی۔" اتنا کہہ کر وہ

کپڑے بدل کر واپس جانے کو تیار ہوئے۔ میں نے کہا "کھانا تو کھاتے جاؤ"
انھوں نے جلدی سے چھڑی اٹھاتے ہوئے کہا "ایک دوست کے گھر دعوت ہے"
"ساڑھے دس بجے کس کے ہاں دعوت ہے؟" میں رُک نہ سکی پوچھ بیٹھی۔
"کس دوست کے ہاں؟"
وہ اس سوال کا کچھ جواب دے سکے۔ شاید انھوں نے یہ سوچا ہی نہ تھا۔ ایک لمحہ کے وقفہ کے بعد انھوں نے لکنت آمیز لہجہ میں کہا "پیارے لال کے گھر!"
"کیوں وہاں کیا ہے آج؟"
اس سوال پر وہ چڑ گئے۔ غصہ سے بولے "تمھیں اس سے کیا۔ ہر بات میں مین میخ نکالتی رہتی ہو۔ ہے کیا۔ آج ان کا بھائی وکالت کے امتحان میں پاس ہوا ہے۔ بس!"
یہ کہہ کر وہ کھٹ کھٹ سیڑھیوں پر سے اتر گئے لیکن مجھے اعتبار نہ آیا۔ کیونکہ ان کا چہرہ ان کے بیان کی تائید نہ کرتا تھا۔ کوئی بیس منٹ بعد میں نیچے اُتری۔ جہاں اسکول کی جماعتیں لگتی تھیں۔ ایک کمرہ میں بڑھیا "مائی" سوتی تھی اسے جگایا، اور پیارے لال کے گھر جانے کو کہا۔
مائی بڑبڑاتی ہوئی اٹھی "کیا کام ہے بہو اتنی رات گئے؟"
"ذرا جانا اور دیکھ کر آنا کہ آیا وہ وہیں دعوت کھا رہے ہیں یا کہیں اور چلے گئے ہیں۔ اور یہ بھی پوچھنا کہ آیا اس وقت وہاں کوئی دعوت بھی ہے یا نہیں؟"
مائی چلی گئی اور وہی جواب لیکر آئی جس کی مجھے توقع تھی۔ وہ وہاں نہیں تھے اور ایل ایل بی کا نتیجہ نکلنے میں ابھی دو دن باقی تھے۔ فوری خیال کے زیر اثر میں اسباب کے کمرہ میں گئی سوراخ سے دیکھا۔ وہاں نقشہ ہی بدلا ہوا تھا۔ جو کمرہ پہلے سونے کیلئے

مخصوص تھا وہ ایک اچھا خاصا بیٹھنے کا کمرہ بنا ہوا تھا۔ فرش پر ایک دری بچھی تھی۔ ایک طرف میز کرسی رکھی تھی۔ اوپر بجلی کا قمقمہ لٹک رہا تھا۔ میز کے پاس دو کرسیاں رکھی تھیں کونہ میں آرام کرسی پڑی تھی۔ میں مایوس ہو کر واپس آئی۔ میرا خیال تھا وہ وہیں ہوں گے لیکن وہ وہاں نہ تھے۔ تاہم مجھے یقین تھا کہ وہ کسی دوسرے کمرے میں ہوں گے۔ میں اگر چاہتی تو جا کر دیکھ آتی لیکن میں اس طرح جانا نہ چاہتی تھی بلکہ چھپ کر سب کچھ دیکھ لینا اور پھر انھیں جتا دینا چاہتی تھی کہ مجھے اس طرح بیوقوف نہیں بنایا جا سکتا۔

مائی نے کہا "کیا میں جا سکتی ہوں؟"

"ابھی کچھ دیر ٹھیرو۔"

مائی کچھ لمحے خاموش کھڑی رہی۔ میں نے کہا "ذرا رامو کو تو بلا لاؤ!"

رامو بی جی کے نوکر کا نام تھا۔ مائی اسے بلانے چلی گئی۔ میں پھر اسی فکر میں محو ہو گئی۔ کوئی دس منٹ بعد رامو آ گیا۔ یہ دس منٹ دس سال کی طرح بیتے۔ میں اسے اندر لے گئی۔ تھوڑی سی مٹھائی جو اُن کے کسی دوست کے گھر سے آئی تھی رسوئی خانہ میں رکھی تھی۔ میں نے وہ سب اسے دیدی اور کہا یہ تمھارے لئے رکھی تھی اسے لے جاؤ۔ ورنہ پڑی پڑی خراب ہو جائیگی۔

رامو کی عمر گیارہ بارہ سال کی ہو گی۔ مٹھائی کو دیکھتے ہی اس کا چہرہ کھل گیا۔ وہ جانے کو تیار ہوا تو میں نے بے پروائی سے پوچھا "ماسٹر جی اُدھر ہی ہیں؟"

"نہیں۔"

"آئے بھی نہیں؟"

"آئے تھے۔"

"پھر!"

"بی بی جی کو ساتھ لیکر چلے گئے ہیں۔" یہ کہہ کر وہ ہنستا ہوا چلا گیا۔ اس سے زیادہ

پوچھنے کی ضرورت ہی نہ تھی۔ میرے شبہ کی جو بنیاد تھی وہ خوب مضبوط ہوگئی۔ کچھ لمحوں کیلئے میں خاموش کھڑی رہی۔ اس طرح گھل گھل کر مرنا، شکوک و شبہات کا شکار ہوکر غم و اندوہ میں جان دینا مجھے منظور نہ تھا۔ میں نے فیصلہ کرلیا کہ اصل بات کا پتہ لگاکر رہوں گی۔"

مائی نے پھر پوچھا "بی بی جی میں جاؤں۔ دیر ہو رہی ہے!"

میں نے کہا "مائی تم سے میں ایک مشورہ کرنا چاہتی ہوں!"

"جی کہو!"

میں اسے اندر لے گئی۔ اور رات کا سب واقعہ کہہ سنایا۔ ایک روپیہ بھی میں نے اس کے ہاتھ پر رکھ دیا۔ اس بات کو پوشیدہ رکھنے کی یہ فیس تھی۔ مائی کی آنکھیں چمک اٹھیں۔ وہ چالاکی اور عیاری جسے اس نے زبردستی چھپا رکھا تھا صاف طور پر اس کی آنکھوں میں عیاں ہوگئی۔ لیکن میں اپنی دھن میں اندھی ہو رہی تھی۔ میں نے اس طرف دھیان نہیں دیا۔ بڑھیا کہنے لگی "بہو میں تو پہلے ہی سے جانتی ہوں۔ میں نے اپنی آنکھوں سے انھیں گلے ملتے دیکھا ہے۔ میں تم سے کہنا چاہتی تھی لیکن کچھ سوچ کر خاموش ہو رہی۔"

میں حسد کی آگ میں جلی جا رہی تھی۔ میں نے کہا "مائی آج وہ دونوں پھر کہیں گئے ہیں۔ مجھ سے کہہ گئے ہیں کہ ایک دعوت میں شامل ہونا ہے۔ لیکن وہاں تم ابھی ہوکر آئی ہو۔ دعوت وغیرہ وہاں کچھ بھی نہیں۔ تم مجھے کسی طرح پتہ بتا دو۔ وہ کس جگہ ہیں میں تمھاری غلام ہو جاؤں گی۔"

مائی نے کہا "یہ کوئی بڑی بات نہیں۔ قیاس سے میں بیٹھی بتائے دیتی ہوں کہ وہ ضرور کسی ہوٹل میں گئے ہوں گے۔ یا اس مکان میں جو انھوں نے خفیہ طور پر لے رکھا ہے۔"

میں چونکی "کیا انھوں نے کوئی خفیہ مکان لے رکھا ہے؟"

"لے تو رکھا تھا۔ اب پتہ نہیں۔ ان کے پاس ہے یا نہیں!"

"اب کہاں ہونگے؟"

"پتہ لے کر بتا سکتی ہوں!"

میں نے اس کے ہاتھ میں ایک روپیہ اور رکھ دیا۔ اور شکریہ آمیز نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔

مائی کی باچھیں کھل گئیں۔ میں نے کہا "مائی کسی طرح پتہ لے دو۔ میں تمہاری غلام ہو جاؤں گی"

وہ چلی گئی اور ایک گھنٹے کے بعد اس نے بتایا کہ "وہ دل کشا ہوٹل میں ہیں اور انھوں نے رات کیلئے ایک کمرہ لیا ہے"

"تم نے کیسے پتہ لیا"

"ہوٹل والے میرے واقف ہیں میں نے باتوں باتوں میں ان سے پوچھ لیا۔

"مجھے دکھا دو!"

"یہ مشکل ہے!"

اسکولوں کی اکثر بڈھیاں ملازم عورتیں لڑکیوں کو بہلا پھسلا کر ہوٹلوں وغیرہ میں لے جاتی ہیں۔ یہ میں نے سن رکھا تھا۔ لیکن ہماری مائی ان میں سے ایک ہوگی یہ میں نے کبھی نہ سوچا تھا۔ کوئی دوسرا وقت ہوتا تو میں اس کے جوتے لگوا کر باہر کر دیتی لیکن اس وقت میں خود اپنی غرض میں اندھی ہو رہی تھی۔ اس وقت میری حالت اس جواری کی سی تھی جو ہر بار ہار کر اور زیادہ داؤں پر لگائے جاتا ہے۔ میں نے دس روپے کا نوٹ مائی کے ہاتھ پر رکھ دیا۔

"یہ تم ہوٹل والے کو دیدو۔ اس سے کہو کہ کسی طرح مجھے ان دونوں کو دکھا دے"

مائی راضی ہو گئی۔ ہم دونوں دلکشا ہوٹل گئے۔ مائی نے کس طرح اسے سمجھایا۔ کیا کہا۔ کتنے روپئے دیئے؟ یہ مجھے معلوم نہیں لیکن میں جو چاہتی تھی وہ ہو گیا۔ رات کے بارہ بجے دروازے کے شگاف میں سے میں نے جو کچھ دیکھا اسے دیکھ کر میں کانپ گئی جی میں آئی کہ شور مچا دوں۔ سر پھوڑ لوں لیکن پھر چلی آئی۔ جب ہم گھر پہنچے تو دور کسی گھڑیال نے ایک بجایا۔

میں نے مائی کو تنہائی میں لے جا کر کہا "مجھے تھوڑی سی افیم لا دو"

"افیم! کیوں بہن افیم کیوں؟"

"مجھے چاہیئے" اور یہ کہہ کر میں نے مائی کے ہاتھ میں روپیہ رکھ دیا۔

رات میں نے بڑی بے چینی سے کاٹی تھی۔ اپنی بے بسی پر ساری رات میں روتی رہی تھی۔ اس دن میری بات کا جواب دیتے ہوئے انھیں جو جھجک در پیش تھی اس کا مطلب کھل گیا۔ ساری رات میں سوچتی رہی لیکن کسی نتیجے پر نہ پہونچ سکی۔ میری بات کا جواب دیتے ہوئے کہ وہ بی بی جی کو ماں کی طرح سمجھتے ہیں یا نہیں۔ ان کی زبان میں جو لکنت آ گئی تھی اس کی وجہ رات صاف طور پر عیاں ہو گئی۔ ہائے مجھے یوں نظر انداز کر دیا گیا گویا میں اس دنیا میں ہوں ہی نہیں۔ اگر اسی طرح غیر عورتوں کی صحبت میں رہنا تھا تو مجھے بیاہ کر کیوں لائے۔ اور اگر بیاہ ہی لائے تھے تو مجھ سے محبت ہی کیوں کی۔ مجھے کیوں زد و کوب کرنا سکھا دیا۔ اب کچھ کہوں گی تو زد و کوب کی جاؤں گی۔ چھڑی سے میری خبر لی جائے گی۔ بیوی کی حیثیت ہی کیا ہے وہ کر ہی کیا سکتی ہے خاوند چاہے تو اسے مار مار کر ادھ موا کر دے۔ زندہ زمین میں گاڑ دے گھل گھل کر مرنے کیلئے چھوڑ دے۔ چاہے تو اس کے سامنے عیش کرے۔ اس کی چھاتی پر مونگ دلے۔ وہ کچھ نہیں کر سکتی، روک نہیں سکتی، لب تک نہیں ہلا سکتی۔ خاوند عورت کے سامنے

دوسروں سے تو لگائے۔ اسے خاموش رہنا ہوگا۔ لیکن اگر عورت دوسرے مرد کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی دیکھے تو شور برپا کیا جا سکتا ہے۔ قابلِ گردن زدنی قرار دیا جا سکتا ہے ہائے بے چاری عورت! میں نے ایک لمبا سانس لیا۔ اس زندگی سے موت ہزار درجے اچھی ہے لیکن اس طرح خاموشی سے مرنا مجھے منظور نہ تھا۔ اور اسی لئے جب دوسرے دن دس بجے کے قریب وہ آئے تو میں نے پوچھا "ساری رات دعوت ہوتی رہی کیا؟"

"نہیں، ذرا دیر ہو گئی تھی۔ پیارے لال نے کہا یہیں پڑ رہو۔ چنانچہ وہیں لیٹ گئے!"

مجھے اس سفید جھوٹ پر غصہ آ گیا۔ میں نے کہا "دعوت تو آپ کہتے ہیں کہ پیارے لال کے گھر کھا رہے تھے۔ لیکن دل کشا ہوٹل میں گلچھرے کون اُڑا رہا تھا؟

دل کشا کا نام سنتے ہی وہ چونکے۔ کانپے۔ ان کا رنگ زرد ہو گیا۔ لیکن فوراً سنبھل گئے۔ کہنے لگے "دل کشا کون گیا تھا؟"

"آپ گئے تھے اور آپ کے ساتھ تھیں وہ جنھیں آپ ماں کہتے ہیں۔ میں آپ سے پہلے کہہ چکی ہوں کہ یہ ڈھونگ چھوڑ دیجئے۔ میں اپنی آنکھوں سے سب کچھ دیکھ آئی ہوں۔ یوں میری آنکھوں میں دھول آپ نہ جھونک سکیں گے۔ مجھے آپ مارنا چاہتے ہیں مار دیں۔ اپنے راستے سے علیحدہ کرنا چاہتے ہیں علیحدہ کر دیجئے۔ ٹکڑے ٹکڑے کرنا چاہتے ہیں کر دیجئے۔ لیکن میں اپنی آنکھوں کے سامنے یہ سب کچھ نہ ہونے دوں گی۔"

میں رونے لگی۔ ان کی آنکھوں میں خون سا دوڑ گیا لیکن وہ پھر ضبط کر کے اندر چلے گئے۔ کچھ دیر بعد انھوں نے خاموشی سے آ کر کہا "لیجا تم مجھے اس طرح بات بات پر روک نہیں سکتیں۔ اس طرح میرے پاؤں میں زنجیر نہیں ڈالی جا سکتی۔ اگر میں

ہوٹل میں گیا تو آپ ایسی جگہ کیوں گئیں اور کس کے ساتھ گئیں ؟"

"میں نہیں گئی !"

"تمھارا چہرہ اس بات کی تائید نہیں کرتا"

میں خاموش رہی انھوں نے جوش سے کہا "مجھے معلوم نہ تھا تم نے اس قدر پر نکال لئے ہیں۔ ابھی تم نے خود کہا میں نے اپنی آنکھوں سے سب کچھ دیکھا ہے۔ تو تم خود رات کے وقت ہوٹل میں گئیں۔ جاؤ میری طرف سے ہوٹلوں میں جاؤ۔ کوٹھی خانوں میں جاؤ۔ جہاں مرضی ہے جاؤ۔ میں نہ بولوں گا۔"

اتنا کہہ کر وہ چلے گئے۔ ان کے اس اتہام پر میں سُن ہو کر رہ گئی۔ ایک چوری ، دوسرے سینہ زوری۔ آپ دوسری عورت کو لیکر ساری ساری رات ہوٹل میں بیٹھے ہیں۔ تو کوئی بُرا نہیں کرتے۔ اور میں اگر آپ کو اسی ہوٹل میں دیکھنے چلی گئی تو قیامت آ گئی۔ ان کا ایک ایک لفظ سوئی بن کر میرے دل کو چھیدنے لگا۔ مایوسی ، غصہ ، رنج اور توہین سے میں رونے لگی۔ میں نے فیصلہ کر لیا میں انھیں مر کر دکھا دوں گی۔ پاپی کون ہے میں یا وہ۔

مائی نے روپیہ واپس دیتے ہوئے کہا "بھلا بہو یوں اُداس کیوں ہوتی ہو ؟ میں جان گئی ہوں ماسٹر جی نے تمھاری پرواہ نہیں کی۔ لیکن مرد سو سو باتیں کرتے ہیں اگر ان کی ایک ایک بات پر یوں رونے کو بیٹھ جائیں تو کیسے گذر ہو سکتی ہے ۔"

میں نے کہا "نہیں مائی تم میرا یہ کام کر دو۔ یہ لو روپیہ میں تمھیں اور دیتی ہوں میرا جی پک گیا ہے۔ میں جینے سے بیزار ہوں۔ جس زندگی میں کوئی لطف نہیں ، جس کی کسی کو پرواہ نہیں جسے کڑھ کڑھ کر ختم ہونا ہے۔ اسے پال کر میں کیا کروں گی۔"

"نہ بہو اس طرح رو رو کر جی کو ہلکان نہ کرو" مائی نے اپنے دوپٹے کے آنچل سے میرے آنسوؤں کو پونچھتے ہوئے کہا "تم خود اپنی زندگی کی پرواہ کرو گی تو ساری

دنیا اس کی پروا کرے گی۔ یہ تم نے کیا کہا۔ یہ دن مرنے کے ہیں۔ یہ سن اور یہ بڑھاپا ہی"

میں خاموش رہی۔

بڑھیا پھر بولی "تم بھولی ہو بہو۔ ان مردوں کو بس میں کرنا کیا جانو۔ جوں جوں تم ان کے گلے پڑتی جاؤ گی۔ یہ پرے ہٹتے جائیں گے۔ لیکن جونہی تم ذرا بے رخی کا برتاؤ کرو گی یہ تمہارے تلوے چاٹیں گے۔"

میں پھر بھی خاموش رہی۔ میں نے صرف ایک لمبا سانس لیا اور منہ پھیر کر ایک لمحہ کیلئے اپنی صورت کو شیشے میں دیکھا۔

مائی نے پھر کہا "بہو میری اتنی عمر ہوئی کئی عورتوں کو میں نے موت کے منہ سے بچایا۔ پرماتما نے انسان کو اس لئے پیدا کیا ہے کہ وہ دنیا کا اور دنیا میں پیدا کی ہوئی نعمتوں کا پورا فائدہ اٹھائے۔ اس نے یہ سب قانون نہیں بنائے جن سے عورتوں پر بہت سی چیزوں کے دروازے بند کر دیئے گئے ہیں۔ یہ قانون مردوں کے بنائے ہوئے ہیں اور انہیں توڑا جا سکتا ہے۔"

"لیکن عورت کمزور ہے" میں نے اس کی باتوں سے متاثر ہوتے ہوئے کہا۔

"کوئی کمزور نہیں" مجھ ہی دیکھو۔ میں نے کئی مردوں کو ناک چنے چبوائے۔ بڑے بڑے آدمیوں نے اس غریب کے پاؤں پر سجدہ کیا ہے۔ مرد کی یہ فطرت ہے کہ وہ عورت کی قیمت اس کی خوبصورتی، اس کے اعضا کے تناسب، اس کے گورے رنگ، اس کے تیکھے نقش کی وجہ سے نہیں لگاتا بلکہ اس قیمت سے لگاتا ہے جو دوسرے لوگوں کی نظروں میں اسے حاصل ہے۔ تم اپنے آپ سے بے پرواہ رہتی ہو۔ میلے کپڑے پہنے رہتی ہو اور مرد تنوع پسند ہے۔ مرد کیا انسان تنوع پسند ہے۔ ذرا اپنے آپ میں تبدیلی پیدا کرو۔ ذرا اپنا خیال رکھا کرو۔ انہیں معلوم ہو جائے کہ تم بھی انہیں چھوڑ سکتی ہو۔ تم پہ بھی کوئی جان نچھاور کر سکتا ہے۔ بس وہ تمہارے ہو کر رہیں گے۔ اور اگر وہ

تمھارے نہ بھی ہوئے تو بھی مرنے سے تو یہ سب کہیں اچھا ہوگا۔ تم اتنی نادان نہیں کہ میرا مطلب نہ سمجھ سکو۔ بھلا مرنے سے کیا تم اپنا مقصد حاصل کر سکو گی؟"

اسکول کا وقت ہوگیا تھا۔ مائی چلی گئی، اس کا ایک ایک فقرہ میرے دماغ میں گھومنے لگا۔ میں نے سوچا مائی ٹھیک تو کہتی ہے۔ مر کر کہیں اپنا مطلب پا سکتی ہوں میرے مرنے کے دوسرے ہی دن سوت بیاہ لائیں گے۔ جو جیتے جی یہ کرتے ہیں وہ مرنے کے بعد کیا کچھ نہیں کر سکتے۔ نہ میں ایسا نہ ہونے دونگی۔ انھیں بتادوں گی کہ میں عام عورتوں، کمزور اور بزدل عورتوں میں سے نہیں جو مردوں کی جوتی بن کر رہتی ہیں۔ جو ان کے ہر جائز اور ناجائز کام کے آگے سر جھکا دیتی ہیں۔ انھیں یا تو میرا بن کر رہنا ہوگا یا مجھے بھی . . . .

بس میں اس کے آگے کچھ نہیں سوچ سکی۔ اٹھی۔ اٹھ کر جلدی جلدی کام ختم کیا۔ اور پھر نہا دھو کر بال بنائے۔ ساری بدلی۔

شیشے میں اپنی صورت دیکھی۔ لبوں پر مسکراہٹ آگئی۔ اس وقت بلونت جی پڑھانے کو آگئے۔

میں نے انھیں کرسی دی۔ اور پڑھنے کیلئے بیٹھ گئی۔ انھوں نے مجھے ایک دفعہ کنکھیوں سے دیکھا۔ شاید انھیں کچھ حیرت سی ہوئی۔ شاید وہ اس کایا پلٹ پر کچھ مبہوت سے رہ گئے۔ ہماری آنکھیں چار ہوئیں۔ میرا دل دھک دھک کرنے لگا۔ لیکن میرے دل میں انتقام اور حسد کی آگ جل رہی تھی۔ میں مسکرا دی۔ انھوں نے نگاہیں نیچی کر لیں۔ اور پڑھانے لگے۔ لیکن میں نہ پڑھ سکی۔ جو وہ پوچھتے مجھے بھول بھول جاتا۔ وہ میٹھی سرزنش کرتے۔ میں مسکرا دیتی۔ بار بار ان کی نگاہیں میری طرف اٹھتیں۔ بار بار ہماری نگاہیں چار ہوتیں۔ پڑھتے پڑھتے میرا ہاتھ ان کے ہاتھ سے مس ہوگیا میرے جسم میں سنسنی دوڑ گئی۔ ان کا جسم کانپا۔ انھیں پیاس سی لگی۔ خشک گلے کے ساتھ

انھوں نے پانی مانگا۔ میں بھاگ کر رسوئی خانہ سے پانی کا گلاس لے آئی۔ ایک دو گھونٹ پی کر وہ مجھے پڑھانے لگے۔ اس وقت مجھے بھی پیاس لگی۔ میں نے کہا "مجھے پیاس لگی ہے"

"اٹھ کر پی آؤ"

"اب کون اٹھ کر جائے" یہ کہتے ہوئے میں نے ایک بار ان کی طرف دیکھا اور ان کا جھوٹا گلاس اٹھا کر منہ سے لگا لیا۔

وہ میری طرف حیرت سے دیکھتے رہ گئے۔

میں کنڈی لگا کر چپ چاپ کھڑی رہ گئی۔

پنڈت جی فوراً چلے گئے تھے اور میں ان کی نظروں ہی میں نہیں خود اپنی نظروں میں گری جا رہی تھی۔ مجھے اپنے آپ پر غصہ آ رہا تھا۔ میں اندر سونے کے کمرہ میں بھاگ گئی اور بے اختیار رونے لگی۔ ہائے ری گراوٹ! میں نے کیا کر دیا۔ اتنی مدت سے پالے پوسے دھرم کے ہرے بھرے پودے کو یوں ایک لمحہ کی کمزوری میں کاٹ پھینکا۔ مان لیا انھوں نے میری توہین کی تھی۔ مان لیا انھوں نے مجھ سے بے التفاتی کا برتاؤ کیا تھا یا نا انھوں نے مجھے اپنی نظروں سے گرا دیا تھا لیکن کیا مجھے بھی ایسا کرنا چاہیئے تھا۔ کیا مجھے بھی اس طرح گر جانا چاہیئے تھا۔ اپنے کئے پر پچھتانے اور پشیمانی کی آگ نے میرے روئیں روئیں کو جلا دیا۔ سارا دن میں نے کچھ نہ کھایا، سارا دن میں اپنے کمرہ سے باہر نہ نکلی۔ میں چاہتی تھی وہ آ جائیں تو ان کے سامنے بلا کم و کاست اپنا گناہ رکھ دوں۔ گناہ کے ارتکاب کی وجہ بیان کر دوں۔ ایک دفعہ پھر منّت و سماجت سے انھیں سمجھا دوں۔ انھیں بتا دوں کہ اس طرح بات نہ بنے گی۔ کچھ انھیں قربانی کرنا ہو گی کچھ مجھے۔ اس طرح ہی گرہستی کی گاڑی چل سکتی ہے۔ میں چاہتی تھی ان کے سامنے روؤں۔ ان کے پاؤں پڑوں انھیں کہوں کہ باہر باہر ہے اور گھر گھر۔ جب تک رگوں میں جوش ہے۔ جیب میں پیسے

ہیں، جسم میں خوبصورتی ہے۔ باہر حسین معلوم ہوگا لیکن جب انہیں ڈھلک جائیں گی، خوبصورتی کی جگہ بدصورتی لے لے گی اور جیب کے پیسے ختم ہو جائیں گے تو تم ہی پرسانِ حال ہو گا۔

شام تک میں انتظار کرتی رہی لیکن وہ نہ آئے۔ جی میں ایک بار آئی ادھر جا کر دیکھوں کیا ہو رہا ہے لیکن پھر وہیں لیٹی رہی۔ جی ہی اٹھنے کو نہ چاہا۔ دو گھنٹے اور اسی طرح بیت گئے۔ شام کے سات بجنے کو آئے۔ میں اٹھ کر کھڑکی میں آ بیٹھی کہ کہیں رامو نظر آئے تو انھیں بلوا بھیجوں۔ بہت دیر تک بیٹھی رہی لیکن وہ نظر نہ آیا۔ آخر تھک کر اٹھنے ہی لگی تھی کہ وہ بازار سے آتا دکھائی دیا۔ میں نے اسے آواز دی، وہ اوپر آ گیا۔ میں نے کنڈی کھولے بغیر اس سے پوچھا: ”ماسٹر جی اُدھر ہی ہیں؟“

”ہاں۔“

”کہو کھانا تیار ہو چکا ہے آ کر کھا لیں۔“

”وہ کھانا کب کے کھا چکے ہیں۔“

اتنا کہہ کر وہ چلا گیا۔ میری آنکھوں میں پھر آنسو چمک آئے اور میں بستر پر لیٹ کر سُبک سُبک کر رونے لگی۔ رات میں نے آنکھوں ہی میں کاٹ دی۔ صبح ہوئی تو سر چکرا رہا تھا۔ بھوک کے مارے جان نکلی جا رہی تھی۔ یوں بھوکے رہنے کا مجھے تجربہ نہ تھا برت وغیرہ میں نے کبھی رکھے نہ تھے۔ ایک ہی دن میں طاقت سلب ہو گئی۔ اٹھی تو آنکھوں کے آگے اندھیرا آ گیا۔ پھر وہیں چارپائی پر بیٹھ گئی۔ اور اپنی بے بسی پر ایک بار پھر آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔ لیکن دل کڑا کر کے پھر چوکے برتن میں لگ گئی۔ کل کا باسی کھانا باہر پھینکا، صفائی کی، کھانا بنایا، نہائی دھوئی اور پھر لیٹ گئی۔ کچھ دیر بعد پنڈت جی آئے۔ میں نے ان سے کہہ دیا میری طبیعت ٹھیک نہیں۔

”کیوں کیا بات ہے؟“ ان کی آواز کچھ سوز کا پہلو لئے ہوئے تھی لیکن میں نے

جواب نہ دیا۔ وہ چلے گئے۔ میں پھر ان کا انتظار کرنے لگی۔ راموصبح صبح کھڑکی کے سامنے سے گذرا۔ میں نے اس سے انھیں بھیجنے کو کہا۔ لیکن وہ نہ آئے۔ کہلا بھیجا: "مجھے فرصت نہیں ہے۔" میرے دل کو بڑی ٹھیس لگی۔ جی میں آئی کہ ایک دفعہ جا کر جی جی کے بھی پاؤں پڑ آؤں۔ لیکن نتیجہ کچھ نہ نکلے گا۔ اس بات کا مجھے یقین تھا۔ مفت میں بے عزتی ہوگی۔ ایک بار جانے کیلئے اٹھی لیکن خودداری نے پھر میرے پاؤں پکڑے۔ میرا سویا ہوا غرور پھر جاگ اٹھا۔ ہائے میں اتنی گئی گذری ہوگئی۔ کیا میری وقعت اتنی کم ہوگئی۔ اتنی بار بُلایا نہ آئے۔ مجھ سے تو ایک بھکارن اچھی۔ اتنی منت سماجت پر تو اسے بھی خیرات مل جاتی۔ ایک بار خیال آیا سب چھوڑ چھاڑ کر میکے چلی جاؤں۔ لیکن یوں بے بس اور لاچار ہو کر جانا اور گھر میں سوت کو بٹھا جانا مجھے منظور نہ تھا۔ میں اٹھی کھانا وغیرہ اسی طرح ڈھک کر رکھ دیا۔ اندر جا کر لیٹ رہی۔ آج پنڈت جی پھر آئے لیکن ساتھ انھیں بھی لائے۔

میں نے دروازہ کھول دیا۔ میری نحیف و زار صورت دیکھ کر پنڈت جی مبہوت سے کھڑے رہے۔ انھوں نے بھی ایک دفعہ قدرے حیرت سے دیکھا۔ میری آنکھوں میں آنسو جھلملا آئے۔ لیکن اس کی پروا نہ کرتے ہوئے انھوں نے کہا: "پڑھتی کیوں نہیں؟"

"کیا کروں گی پڑھ کر،" میں نے روتے ہوئے کہا۔

میرا خیال تھا ان کا دل پسیج اٹھے گا۔ وہ مجھے اندر لے جا کر سمجھائیں گے۔ وہ مجھ کو خوب خوب پیار کریں گے جیسے ہمیشہ ہوتا تھا لیکن نہیں انھوں نے کسی بات کا خیال نہ کیا۔ میرے زرد چہرے کا، میرے بہتے آنسوؤں کا کچھ خیال نہیں کیا صرف کہا تو اتنا کہا۔

"تمھاری مرضی ہے چاہے پڑھو۔ چاہے نہ پڑھو۔ بعد کو نہ کہنا تمھیں کسی نے پڑھایا نہیں۔ تعلیم یافتہ آدمی سو کام کر سکتا ہے اور ان پڑھ کو در در کا محتاج ہونا پڑتا ہے۔ کون جانتا ہے تمھیں کب اپنے ہاتھوں اپنی روزی کمانی پڑے۔" اتنا کہہ کر وہ سرعت کے ساتھ چلے گئے۔ میں اپنی جگہ ششدر کھڑی رہ گئی۔ میرا تمام جسم کانپ گیا۔ اچھا تو صورت حالات

یہاں تک پہونچ گئی ہے۔ وہ مجھے چھوڑ دینے تک کو تیار ہیں۔ پھر۔ پھر میکہ۔ بے بسی میں وہاں کے دن بسر ہو سکتے ہے۔ اچھا تو پھر یونہی سہی۔ پڑھوں گی ہی۔

پنڈت جی چُپ چاپ کھڑے تھے۔ آہستہ سے بولے:"کیا بات ہے۔ آپ تو ایکدن میں پہچانی نہیں جاتیں۔ مجھ سے اگر کوئی خطا ہو تو معاف کر دیجئے۔"

میں نے بے تابانہ ان کی طرف دیکھا۔ ان کا چہرہ اُترا ہوا تھا۔ میں نے کہا:"نہیں خطا تو مجھ سے ہوئی ہے۔ معافی تو مجھے مانگنا چاہیئے۔ میں نے آپ کو خواہ مخواہ اس دن ناراض کر دیا۔"

پنڈت جی مسکرائے:"ناراض! میں تو آپ کا داس ہوں۔ ناراضگی کیسی۔ مجھے تو ڈر تھا کہ کہیں آپ ناراض نہ ہو گئی ہوں۔"

میں مسکرا دی اور بھول گئی کہ میں دو دن سے بھوکی ہوں۔ بھول گئی کہ میں بہت کمزور ہوں۔ بھول گئی کہ میرا سر چکرا رہا ہے۔ اس وقت جسم میں نئی طاقت، نئی قوت نئی زندگی آگئی۔ اور میں بے کھائے پیئے پڑھنے کو بیٹھ گئی۔

اس ایک ماہ کے عرصے میں گناہ کی کتنی گہرائی میں اتر گئی یہ میں نہیں کہہ سکتی لیکن جب چونکی تو پلٹنا مشکل معلوم ہو رہا تھا اسی لئے اسی راستے پر چلنے لگی۔ جس طرح بھولا ہوا مسافر یہ جانتے ہوئے بھی کہ راستہ غلط ہے اسی پر چلا جاتا ہے کیونکہ وہ اتنا بڑھ چکا ہوتا ہے کہ پھر پیچھے کو مُڑنا مشکل ہو جاتا ہے۔ اس عرصے میں میرے اور بلونت جی کے تعلقات استاد شاگرد کے نہ رہے تھے بلکہ ہم اس رشتے میں منسلک ہو گئے تھے جس میں شاگرد استاد کیلئے عقیدت نہیں رکھتا بلکہ پرستش بھی کرنے لگتا ہے اور استاد شاگرد پر صرف شفقت کی نظر نہیں رکھتا بلکہ محبت کی نظر بھی رکھتا ہے۔ ایک دن جس بات کا ڈر تھا وہ ہو کر رہی۔ نہ جانے کیسے انھیں شک ہوا اور کب انھوں نے ہماری نگرانی شروع کر دی لیکن ایک

دن جب ہم چارپائی پر اکٹھے بیٹھے تھے وہ اچانک داخل ہوئے۔ انھوں نے ادھر آنا بالکل کم کر دیا تھا اور عام طور پر ہم اندر سے کنڈی لگا لیا کرتے تھے۔ لیکن اس دن جانے کیسے کنڈی کھلی رہ گئی۔ پنڈت جی اٹھ کر کرسی پر چلے گئے اور میں نے کتاب اٹھانے کی کوشش کی لیکن انھوں نے کچھ نہیں کہا۔ صرف میری طرف دیکھا اور واپس چلے گئے۔ ان آنکھوں میں کیا تھا یہ میں نہیں کہہ سکتی۔ میرا دل بُری طرح دھڑکنے لگا۔ پنڈت جی کا رنگ زرد ہو گیا۔ انھوں نے مجھے تسلی دینے کی کوشش کی لیکن نہ جانے میرے دل کو کیا ہو رہا تھا۔ میں نے صرف اتنا کہا "آپ جائیے"

اس بات کے باوجود کہ ہم محبت کی تہ تک چلے گئے تھے۔ ہم دونوں ایک ہو گئے تھے، ہم نے ایک دوسرے کیلئے قربان ہو جانے کی بڑی بڑی قسمیں کھائی تھیں۔ انھیں میری بات کو رد کرنے کی جرأت نہ ہوئی۔ ایک مایوس نگاہ ڈال کر وہ خاموشی سے چلے گئے۔

میں لیٹ گئی۔ کیا سوچتی رہی۔ کہہ نہیں سکتی۔ میں اس منزل میں تھی جہاں پہنچ کر انسان کچھ سوچ نہیں سکتا۔ ایک بات صاف تھی۔ اب میں اس حد تک بڑھ چکی تھی کہ پیچھے ہٹنا مشکل تھا۔ اور حالات میں تغیر تو ناممکن سا تھا۔ وہ میری مدد کرتے تو شاید کچھ ہو جاتا لیکن وہ میری طرح گناہ کی سڑک پر سرگرم رفتار تھے۔ اور اسی لئے مجھے اپنے گناہوں پر کسی قسم کا پچھتاوا نہ تھا۔ ہم دونوں ایسی سڑک پر جا رہے تھے جو ایک ہی طرف کو جاتی تھی اور وہ تھی گناہ کی طرف۔ پہلے گناہ کے تاریک غار میں کون گرے گا اس بات کا کسی کو علم نہیں تھا۔ لیکن ہم دونوں جانتے تھے کہ ہم ایک ہی راستے پر گامزن ہیں اور مصلحت ہمیں ایک دوسرے کے گناہوں کو جانتے ہوئے بھی چُپ رہنے کیلئے مجبور کر رہی تھی۔ میں انھیں کئی بار روک چکی تھی۔ اس لئے زیادہ روکنا فضول سمجھتی تھی۔ اور وہ اس لئے خاموش تھے کہ انھیں اپنے گناہوں کا پردہ فاش ہونے کا خوف تھا۔ ایک گرلز اسکول کا محرک اتنا بدچلن ہے۔ اس بات کا ذرا سا شک ہونے پر بھی اسکول فیل ہو سکتا تھا اور اسی

بات کو سوچ کر وہ چُپ تھے۔ ایک بار میرے جی میں آیا اس راستے کو چھوڑ دوں۔ جی میں آیا کہ جب وہ آئیں تو ان سے پوچھوں کہ آخر ہم اس طرح کہاں پہنچیں گے۔ لیکن اس دن وہ نہ آئے۔ ہاں انھوں نے سب سامان دوسری طرف منگا لیا۔ مجھے اس بات کا ذرہ بھر افسوس نہ ہوا۔ یہ تو سب کچھ آخر ہوتا تھا۔ کچھ دن پہلے نہ ہوا اب ہو گیا۔ ہاں اب مجھے مستقبل کی فکر ہوئی۔

دوسری صبح وہ باقی کا ضروری سامان بھی لینے آئے۔ اس دن پنڈت جی بھی نہیں آئے تھے۔ میں اور سب کچھ پوچھنا بھول گئی اور پوچھا بھی تو یہ "پنڈت جی اب آئینگے؟"

انھوں نے کہا "نہیں" اور سامان اٹھوا کر جانے کو تیار ہوئے۔ میں نے پوچھا

"اب اُدھوری رہے گا!"

"ہاں!"

"اور میں؟"

"جہاں تمھاری مرضی تم رہو"

"میکے چھوڑ آؤ"

"مائی کو بھیج دوں گا"

"اور اگر یہاں رہوں"

"شوق سے"

"کھاؤں گی کہاں سے؟"

"پہنچ جایا کریگا"

اور منہ دوسری طرف پھیر کر وہ چلے گئے۔ میں ایک لمحے کیلئے وہیں کھڑی رہی اور پھر اندر جا کر میں نے اپنا سامان ٹھیک کرنا شروع کیا۔ اس طرح دوسرے پہر سوچتی رہی کہ میں ہرگز نہ رہوں گی۔ اگر وہ مجھے چھوڑنا چاہتے ہیں تو میں خود انھیں چھوڑ دوں گی۔

رات کے بارہ بجے ہوں گے۔ اس دن آسمان پر بادل گھرے ہوئے تھے۔ خوب گھٹا ٹوپ اندھیرا چھایا ہوا تھا۔ راستہ میں بجلی کے لیمپوں کی ٹمٹماتی ہوئی روشنی بازار میں چلنے والے بھولے بھٹکوں کی رہبر تھی۔ میں خاموشی سے اپنے زیورات اور روپیوں کی گٹھڑی سنبھالے ہوئے سیڑھیوں سے اتری۔ پنڈت جی پہلے ہی انتظار کر رہے تھے۔ تھوڑی دور چلنے پر ہمیں تانگہ ملا۔ انھوں نے کہا "منڈی کے اوپر سے ہوتے ہوئے اسٹیشن کے سامنے سے "پوتر ہوٹل" کو لے چلو۔

"ادھر سے کیوں نہ چلا چلوں۔ بالکل نزدیک رہے گا۔" تانگہ والے نے تانگہ موڑتے ہوئے کہا۔

"تمھیں جیسے کہا ہے ویسے کرو۔" بلونت جی نے کہا "جلدی کرو۔ بارش شروع نہ ہو جائے۔"

اس دن جب میں سب سامان باندھ کر میکہ جانے کو تیار تھی مائی پنڈت جی کا خط لائی۔ انھوں نے شاید روتے روتے خط لکھا تھا۔ وہ میری محبت میں پاگل ہوئے جاتے تھے۔ میں انھیں اپنے آئندہ ارادوں کے متعلق آگاہ کرنا چاہتی تھی۔ میں نے فیصلہ کر لیا تھا کہ میکے جا کر کسی نہ کسی طرح کچھ پڑھ لوں گی جس سے دس پندرہ کی ملازمت کر سکوں اور بس۔ ملازمت کر کے کسی طرح زندگی کے باقی دن گذار دوں گی۔ کسی پر بوجھ بن کر نہ رہوں گی لیکن پنڈت جی کا خط پڑھتے ہی میرے سب ارادے ہوا ہو گئے۔ میں نے انھیں جواب دیا اور رات کو ملنے کا ارادہ کیا۔ خط لکھ کر میں نے مائی کے ہاتھ میں دیدیا اور آٹھ آنے بھی اس کی ہتھیلی پر رکھ دیئے۔

عین وقت پر وہ آئے۔ ہم دونوں کتنی دیر تک باتیں کرتے رہے۔ فیصلہ یہی ہوا کہ ہم یہاں سے کہیں چلے جائیں۔ میں یہاں ایک سکنڈ کیلئے بھی رہنے کو تیار نہ تھی۔ پنڈت جی نے تجویز کی کہ پوتر ہوٹل میں ایک کمرہ لے لیں گے۔ بہانہ یہ کریں گے کہ رات کی گاڑی سے

وہ پشاور سے آئے ہیں اور رات بھر کیلئے ہوٹل میں رہنا چاہتے ہیں، دوسرے دن ہزدارا کو چلے جائیں گے۔

بادل زور زور سے گرجنے لگا اور ہوا بہت تیز چلنے لگی۔ ہم دونوں اتنی دیر خاموش رہے کوئی خاص بات نہ ہوئی۔ دونوں مستقبل کے متعلق کچھ سوچ رہے تھے۔ اسٹیشن آگیا۔ یہاں سے تانگہ آہستہ آہستہ چلنے لگا۔ پنڈت جی نے بہانہ کی تکمیل کیلئے ایک ٹرنک بستر کے ساتھ رکھ لیا تھا۔ اگر اسٹیشن کی طرف سے شہر کو آئیں تو ریلوے روڈ پر پہلے دل کشا ہوٹل آتا ہے اور پھر پونر ہوٹل۔ تانگہ دل کشا ہوٹل کے پاس رُک گیا۔ کیونکہ سامنے ایک تانگہ کھڑا تھا اور دوسری طرف سے موٹر گذر رہی تھی۔ ہم یہیں سے اُتر کر چل پڑے۔ ٹھنڈی ہوا کی جھونکوں سے میرے سر سے دوپٹہ اترا جا رہا تھا۔ دلکشا ہوٹل کا دروازہ ابھی کھلا تھا۔ میں نے ذرا کپڑے کو دامنہ پر سرکا لیا۔ چند قدم کے فاصلہ پر ایک مرد اور ایک عورت آتے دکھائی دیئے۔ ہوا کا ایک جھونکا آیا اور میرے سر سے دوپٹہ اتر گیا۔ دل کشا ہوٹل سے آنیوالی بجلی کی مدھم روشنی میں میں نے دیکھا "وہ" اور بی بی جی آ رہے ہیں۔ انھوں نے بھی ہمیں دیکھ لیا۔ بی بی جی کا منہ شرم سے لال ہوگیا۔ ان کے چہرے پر پہلے غصہ چھا گیا پھر قدرے تاریکی۔

وہ ہمارے پاس سے ہو کر دل کشا ہوٹل میں داخل ہوگئے اور ہم ان کے پاس سے ہو کر پونر ہوٹل میں!

ختم شد

Date	No.	Date	No.